سفینۂ غزل

مُرتبہ

سید محمد عباس

ناشران:

میبس انٹرپرائزز۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۹۸۵۔ کراچی ۴

یہ بات محلِ شادمانی ہے کہ ہماری گم کردہ راہ غزل کا دھارا قافیہ نوازی و روایت بازی سے روگردانی کر کے، اب حقیقی داخلی شاعری کی جانب مڑتا نظر آرہا ہے۔

جس زمانے میں یہ موڑ پورا ہو جائے گا، اُس وقت غزل، یہ غزل نہیں رہے گی جو آج ہے یا جو آج تک رہی ہے اور اس کا یہ تمام ریگستانی سرمایہ جس کے ناقابلِ شمار ذرّوں کے بے جوڑ تودوں کے اندر کہیں کہیں چند موتی بھی خال خال جھلکتے نظر آتے ہیں ہمارے ادبی شعور کے دورِ طفلی کی محض ایک یادگار بن کر رہ جائے گا۔

اس صورتِ حال پر نگاہ کر کے ایک زمانے سے اس امر کی ضرورت، نہایت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ ایسا نکل آئے جو ایک پختہ کار نیاریے کے مانند غزل کے بے شمار ذرّوں میں سے وہ چند موتی نکال کر محفوظ کرے جو کہیں کہیں جھلکتے دکھائی دے رہے ہیں۔

اور دراصل یہ بڑی ہی طمانیت و مسرت کی بات ہے کہ زمانے کی یہ تمنا بالآخر سید محمد عبّاس کی شکل میں نمودار ہو گئی۔ اور انہوں نے اس ضرورت کو نہایت خوبی کے ساتھ پورا کر کے ایک ایسے کارنامے کی تکمیل کر دی جو تا دیر باقی رہے گا۔

اس بوکھلائے ہوئے بحرانی دور سے یہ توقع رکھنا کہ وہ میرے دوست عبّاس صاحب کی اس جاں فشانی و جبیں جبینی کی قدر کرے گا ایک ایسی ہی فضول بات ہو گی جیسے ہم کسی نابینا سے یہ توقع رکھیں کہ وہ تاج محل کی تعریف کرنے پر اپنے کو آمادہ و فراہم کر سکے گا۔ لیکن اس کرب آمیز احساس کے دوش بدوش مجھے اپنے اس یقین در آغوش تصور سے بڑی خوشی ہے کہ یہ "سفینۂ غزل" اس طوفانی دور کے تُند و تیز دھاروں کو پھاڑتا ہوا ایک نہ ایک دن ابدیت کے ساحل تک ضرور پہنچ جائے گا اور ایک قومی سرمایہ کے مانند باقی رکھا جائے گا اور باقی رہے گا ؎

(جوشؔ ملیح آبادی)

۱۷ر جولائی ۱۹۵۶ء

بشرف ملاحظہ جناب جگنّاتھ آزاد صاحب

سید محمد عباس

22.4.87.

39-A, C.M.A. Colony
Lahore Cantonment
Lahore-13.

اشاعت اول | دو ہزار | مئی ۱۹۵۸ء | قیمت 25 روپئے

انتساب

"سفینۂ غزل" کو میں بصد ادب اپنے والد ماجد سیّد یاور علی صاحب آدر کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اس مجموعہ کے بعض سب سے زیادہ دلآویز اشعار میں نے پہلی بار اُن کی زبانی سُنے ہیں، اور جن احساسات نے بالآخر اس کتاب کی شکل اختیار کی وہ بیشتر اُنہیں کے زیر اثر وجود میں آئے ؛

مؤلف

شکریہ

سفینۂ غزل، کا نام میرے کرم فرما جناب فضل احمد کریم صاحب فضلی کا عطیہ ہے میرے لندن کے قیام کے زمانہ میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر حامد حسن صاحب بلگرامی اور ٹچگانگ کے دورانِ قیام میں پروفیسر اقبال عظیم صاحب کے مشورہ سے کتاب کی ترتیب میں وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھایا گیا۔ جناب راغب مرادآبادی صاحب نے پروف کی تصحیح میں قابلِ ستائش توجّہ اور جانفشانی سے کام لیا۔ تصویر سرورق پروفیسر عسکری صاحب، کراچی کے مایۂ ناز آرٹسٹ کا کارنامہ ہے۔ میرے عزیز دوست ڈاکٹر عترت حسین صاحب زبیری نے باوجود اپنی مصروفیتوں کے اس مجموعہ کے لئے جو عالمانہ پیش لفظ تحریر فرمایا وہ آپ کے سامنے ہے۔ ان تمام احباب کا میں تہِ دل سے شکر گزار ہوں:

سیّد محمد عبّاس۔ کراچی۔ مئی ۵۸ء

در ایں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مے ناب و سفینۂ غزل است



Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

سفینۂ غزل

فہرست مضامین

[1] صفحہ نمبر ۱۵۸ ۔ یہ غزل راسخ دہلوی کی ہے جو داغ کے ہمعصر تھے ۔ غلطی سے راسخ عظیم آبادی کے دھوکے میں اس باب میں شامل ہوگئی ہے ۔ (مؤلف)

پیشِ لفظ

از

جناب ڈاکٹر عترت حسین صاحب زبیری ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، ڈی لٹ (اڈنبرا)
ایجوکیشنل ایڈوائزر گورنمنٹ آف پاکستان

عبّاس صاحب کے مرتّب کردہ مجموعہ میں جو ذوقِ سلیم کارفرما ہے اُس پر نظر کیجیے تو پالگریو۔ ڈبلو بی۔ بیٹیس اور اینڈریو کے سلیقہ کار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اسلئے کہ اردو کے معلومہ یا متداول انتخابات میں اس تکلّف اور اِس خصوصی ذوق کا کوئی اور انتخاب نظر نہیں آتا۔

مقدّمہ پڑھنے کے بعد، جو چھ ابواب پر مشتمل ہے، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عبّاس صاحب نے اپنے دائرۂ انتخاب کو شعوری طور پر اردو غزل کے صرف بہترین جواہر پاروں تک

محدود کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ صنفِ شاعری کی حیثیّت سے غزل کی تعریف آسان نہیں تاہم میرا خیال ہے کہ انہوں نے غزل کی اُن خصوصیات کو کافی وضاحت سے بیان کر دیا ہے جن سے اِس صنفِ سخن کی انفرادیت بڑی حد تک متعیّن ہو جاتی ہے۔ پہلی خصوصیّت وہ علامتیّت (SYMBOLISM) ہے جو اردو شاعری کے تانے بانے میں ایک تارِ زرّیں کی طرح پیوست نظر آتی ہے ؎

مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

یہ علامتیت صرف عشق و محبّت کی شاعری تک محدود نہیں بلکہ عارفانہ شاعری میں بھی موجود ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہمارا اردو شاعر انگریزی زبان کے سترہویں صدی کے میٹافزیکل شاعروں کی طرح شاعرانہ احساسات کی ایک برگزیدہ دنیا کا مکین ہے۔ جس کے دو رُخ یا دو عالم ہیں۔ کبھی عریاں حقائق کی دنیا ہوتی ہے، اور کبھی خالص تخیّلی دنیا جس میں بعض اقدار تخلیقی ہوتی ہیں،

اور یہی اقدار شاعرانہ جذبات کو ظہور میں لاتی ہیں۔

عبّاس صاحب غزل کے نفسِ موضوع کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں "شاعری جذبات اور تاثّرات کی دُنیا ہے۔ شعرا کی غزلیں اُن کے خیالات و احساسات کا آئینہ ہیں۔ کبھی عشق و محبّت کی باتیں ہیں، کبھی دوستوں سے شکوے، کبھی دشمنوں سے بیزاری، اکثر اپنی بدقسمتی پر روتے ہیں۔ اپنی حماقتوں پر ملامت، اور بعض اوقات محض ایک عنایت کی نظر پر انتہائی خوشی اور شادمانی۔"

مؤلف نے ایسی عشقیہ شاعری پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے جو غیر حقیقی جذبات پر مبنی ہوتی ہے۔ جن کا کوئی ذاتی تجربہ شاعر کو نہیں ہوتا۔ "زیادہ تعداد ایسے شعرا کی ہے جن کے یہاں محض خیالی عاشقانہ مضامین باندھے گئے ہیں۔ ان کی سادہ زندگی میں عشق و محبّت کی رنگینیاں کہاں۔ اس قسم کی شاعری مضمون نگاری کے زُمرہ میں آتی ہے، اور کوئی تعجب نہیں اگر اس کا رنگ کسی قدر پھیکا ہے۔"

عبّاس صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ اردو غزل کی دُنیا محدود ہے، اور یہ

اُن کے ناقدانہ شعور کی دلیل ہے۔ غزل کے میدان میں تخئیلی جولانیوں کے وُہ عظیم طوفان برپا نہیں ہوتے جو "ڈیوائن کامیڈی (DIVINA COMEDEA) یا" دی نیچرا ریرم" (DE NATURA REREEM) جیسے شاہکاروں میں نظر آتے ہیں۔ جہاں شاعر موجُودات کے معمّے کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اُردو غزل کے بعض بہترین اشعار میں جو مخصُوص شاعرانہ رفعتِ خیال موجود ہے۔ اس کی مثالیں میرو غالب کے کلام میں ملتی ہیں ؎

شب وُہ جو پئے شراب نِکلا — جانا یہ کہ آفتاب نِکلا

قربانِ پیالۂ مے ناب — جس سے کہ ترا حجاب نِکلا

مستی میں شراب کی جو دیکھا — عالم یہ تمام خواب نِکلا

تھا غیرتِ بادہ عکسِ گُل سے — جس جوئے چمن سے آب نِکلا

اپنے اختصار، اپنی سادگی اور اُسلوب و افکار کے باہمی ربط و توافُق سے جن کے اندر مادّی دُنیا کے حقائق، شاعری کی دُنیا کی کیفیات کے ساتھ ملے جُلے چلے جاتے ہیں۔ بلاشبہ

غزل نے فکر وتخیّل میں ارتباط پیدا کرنے کی ایک عجیب اچھوتی مثال پیش کی ہے - یہ شاعری ایک مخصوص فلسفیانہ تصوّر پر مبنی ہے - جو تمام کائنات اور خصوصاً افسانۂ زندگی میں انسان کے منصب وکردار سے تعلّق رکھتا ہے، اور ہر معیار و اعتبار سے دُنیا کی اعلیٰ ترین شاعری میں شمار کئے جانے کی مستحق ہے -

اس مجمُوعے کی تدوین میں تاریخی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے - عبّاس صاحب نے جیساکہ مُناسب تھا امیر خسرؔو اور ولؔی دکنی سے ابتدا کی ہے - پھر اٹھارویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک رُجحانات کی مُناسبت سے دور بہ دَور غزل کی شاعری کی رفتار پر نظر ڈالتے چلے گئے ہیں - مگر اُنہوں نے ایسے ہمعصر شعرا کو اس انتخاب میں شامل نہیں کیا جو ہماری خوش قسمتی سے ابھی سلامت ہیں - اس انتخاب کی ایک اور دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عبّاس صاحب نے اساتذہ کے سلسلۂ تلامذہ بھی درج کردئے ہیں، اور اس طرح اس روایاتی شاعری کا اہم شخصیاتی پہلو بالکل واضح ہوگیا ہے - یہ بڑی اچھوتی کاوش ہے - اس سے وہ تخیُلی اُسلوب نمایاں ہوتا ہے جو اس تالیف میں

برتا گیا ہے۔

تیسری خصوصیت اس انتخاب کی یہ ہے کہ مؤلف نے بعض ایسے شعرا کو بھی اپنے اپنے تاریخی مقام پر دکھایا ہے جو بیشتر گوشۂ گمنامی میں رہے ہیں۔ یہ اس تلاش و تحقیق کا ثمرہ ہے جس کا موقع عبّاس صاحب کو برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں حاصل ہوا۔

مجھے یقین ہے کہ ان شعرا کا کلام اپنی شیریں بیانی کی بدولت پڑھنے والوں کے مرغوبِ خاطر ہوگا۔ یہ درست ہے کہ ان غیر معروف شعرا کے محاسنِ کلام عموماً مختصر اور محدود ہیں اور ان میں آورد کی جھلک بھی ملتی ہے۔ مگر ان میں جگہ جگہ بڑی خوش آیند نغمہ سرائیاں بھی سننے میں آجاتی ہیں ؎

محراب کعبہ پاوے ایسے کہاں نمازی ابرو کی یہ بلندی، مژگاں کی یہ درازی

(فغاںؔ)

⁂

سن فصلِ گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں
کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں

اس سفینۂ غزل کو تاریخی ترتیب سے دیکھئے تو حُسن شعری کی وُہ لازمی وحدت نظر آتی ہے جو زمانہ کے تغیّرات کے باوجود برابر برقرار رہی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ غزل کی دنیا یا دائرۂ تخلیق شعوری طور پر ویسی ہی محدُود و متعین ہے جیسی کہ مرصّع سازی یا مُوقلم کی دُنیا، مگر یہ فن اپنی خلقی صداقت، زندگی کی عکّاسی نیز حُسن و محبّت اور موت اور فنا کے وقیع موضُوعات کی بدولت زندہ رہا ہے۔ شاعروں نے اس حقیقت کو روشن کیا ہے کہ اس کائنات کی رنگارنگی میں ایک بنیادی وحدت موجُود ہے۔ اکثر نے اُن کا ادراک تحلیل و تجزیہ کے ذریعے کیا ہے۔

چونکہ غزل متفرّق اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے شاعر اپنے ذہن کے تصوّرِ شعری کو علیحدہ علیحدہ عناصر میں پیش کرتا ہے۔ ہر جذباتی تجربہ ظُہور میں آتے ہی مختلف اجزا میں تحلیل ہو جاتا ہے اس لئے غزل میں سالمیّت نہیں پائی جاتی۔

اب دیکھئے کہ غزل کے ایک مسلّم الثبوت اُستاد مومن اپنے محبوب سے مُلاقات کا یادگار نقش کس طرح پیش کرتے ہیں ؎

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز، دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

اُڑتے ہی رنگِ رُخ مرا نظروں سے تھا نہاں
اس مُرغِ پرشکستہ کی پرواز دیکھنا

دُشنامِ یار، طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نَفَس نزاکتِ آواز دیکھنا

اور غالب اپنے ذوقِ نظّارگی کو ایک ایسی نزاکتِ خیال کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس میں رُوحانی بصارت پائی جاتی ہے۔

نظّارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

غزل میں شدّتِ جذبات کے ساتھ تخلیقی عمل کی لطیف آمیزش نظر آتی ہے جس کی بدولت زندگی کی بابت ہمارے غور و فکر میں ایک تسلسُل قائم رہتا ہے۔ اگرچہ مشاہدات مُختلف اور متنوّع ہوتے ہیں۔ موجودہ تہذیب و تمدّن میں روزمرّہ زندگی کے لئے مخصُوص ہے اور نظم شدید ترین ذہنی تجربات کے اظہار کے لئے حلقۂ شعرا تک محدود ہے، اس لئے ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ایک ایسا زمانہ تھا جب نظم ہی عام مطالب کے اظہار کا ذریعہ تھی اور نثر اہلِ علم کا خاص آلۂ کار تھی۔

اگر یہ انتخاب ان لوگوں کے ہاتھوں مُرتّب ہوتا جن کا کلام اس میں شامل ہے تو ہر عہد کی شاعری کا نمونہ اس سے بہت مُختلف نوعیت کا ہوتا۔ اس میں قدامت کی جھلک زیادہ ہوتی اور شاید موعظانہ رنگ غالب ہوتا۔ مگر عبّاس صاحب کا انتخاب بے لاگ بھی ہے اور جامع بھی۔ اس طرح یہ قیدِ زماں سے بے نیاز ہو گیا ہے۔

مؤلّف کی نظرِ انتخاب نے غزل کے پُرسوز و پُرگداز لہجے اور حُزنیہ رنگ کو بھی نمایاں کر دیا ہے ؎

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دَوا نے کام کیا
دیکھا، اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

میرؔ کے کلام میں یہ حزنیہ رنگ زیادہ نمایاں ہے، اور اُن کے ذاتی آلام و مصائب کی وجہ سے اور زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ مگر ایک پُرسوز آہنگ تمام غزل کی شاعری میں موجود ہے۔ یہ کہیں مدہم ہے، کہیں گہرا، تاہم غزل وُہ نغمۂ محبت ہے جس کا ساز کبھی بے سوز نہیں۔ اس غم کی بدولت اس صنفِ شاعری میں ایک رفعت و متانت پیدا ہو گئی ہے دُنیا کی بے ثباتی اور محبت کے شدید، گوناگوں تاثرات نے اس کیفیت کو اور زیادہ ترقی دی ہے اور اس شاعری کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کر کے لازوال ادب میں شامل کر دیا ہے۔

کراچی

مارچ ۱۹۵۸ء

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مُدّت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

میرؔ

مُقدّمہ

اُردُو زبان کا آغاز اور شاعری کی ابتدا

شمال مغربی ہندوستان ایک عرصۂ دراز سے مختلف قوموں کی گذرگاہ رہا ہے۔ یونان، تُرکستان، افغانستان، ایران، عرب، اور دوسرے ملکوں کے باشندے آکر اس علاقہ میں ٹھہرے اور ایک کثیر تعداد میں یہیں آباد ہو گئے۔ مقامی باشندوں کے ساتھ ان غیر ملکی لوگوں کے روزانہ کے تعلّقات کے باعث ہر جگہ ایک ملی جلی بولی بن گئی جس میں یورپ کی قوموں کی آمد و رفت سے پُرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی الفاظ بھی داخل ہوتے رہے۔ دہلی تمام ہندوستان کا مرکز تھا اس لئے جو زبان وہاں

مروّج ہوئی وہ زیادہ مستند سمجھی گئی اور رفتہ رفتہ اس نے ادبی حیثیت حاصل کی۔ دسویں اور پندرہویں صدی کے درمیان اس زبان میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں اُن کے ذریعہ سے بالآخر زبانِ اُردو وجود میں آئی۔

ایک عرصہ تک یہ نئی زبان صرف بول چال میں رائج تھی۔ لکھنے پڑھنے کے کام کی نہ سمجھی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ لوگ اپنے نجی خط بھی فارسی میں لکھتے تھے۔ شمالی ہندوستان میں سترہویں صدی تک اس کے صرف چند ادبی نمونے ملتے ہیں۔ سب سے پہلی غزل امیر خُسرو سے منسُوب ہے۔ اس کے دو سو برس بعد تلسی داس اور کبیر داس کے گیت ہیں جن کو ہندی شاعری میں شمار کرتے ہیں۔ سولہویں صدی کے دوران میں دکن کے علاقہ میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی خود مختار ریاستوں میں بادشاہوں اور امیروں نے مُوسیقی، مُصوّری اور شعر و شاعری کی طرف توجّہ کی۔ اور غالباً اس لئے کہ اس علاقہ کے حکمران اپنے اصلی وطن سے بہت دور پہونچ گئے تھے۔ انہوں نے دیسی زبان کی طرف بہ نسبت شمالی ہندوستان والوں کے زیادہ توجّہ کی۔ آخر

محمد شاہ کے زمانہ میں اورنگ آباد دکن سے شمس الدین ولی دہلی پہونچے اور اُن کا کلام سُن کر دہلی والوں کو پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ اس نئی زبان میں جس کو ابھی تک ریختہ کہتے تھے، اور جواب اردو کہلائی، شعر و شاعری کی کتنی صلاحیت تھی۔ ولی کے زمانہ سے حسرت موہانی تک اُردو غزل کی شاعری جن جن منزلوں سے گُذری ان کا مختصر بیان ہم مختلف ادوار کے تحت شعرا کے حالات کے ساتھ پیش کریں گے۔ ذیل کے تاریخی تجزیہ سے یہ اندازہ لگانے میں سُہولت ہوگی کہ مختلف شعرا کے زمانہ میں ملک میں کیا واقعات پیش آرہے تھے۔

٭

تاریخی تجزیہ

۱۲۰۰ء ۱۵۰۰ء	دہلی کی سلطنت اور مسلمان بادشاہوں کا عروج علاءالدین خلجی کی فتوحات، حضرت نظام الدین اولیاء اور دوسرے صوفیائے کرام کا زمانہ تیمور کا	اردو زبان کا آغاز حضرت امیر خسرو (۱۲۵۳ء ۱۳۲۴ء)

	حملہ (۱۳۹۸ء) دکن میں بہمنی حکومت،	
۱۵۰۰ء-۱۶۵۰ء	مغلیہ سلطنت کا عُروج، زرّیں عہدِ اکبری، دکن میں گولکنڈہ، بیجاپور اور دوسری سلطنتوں کا عروج	خانِ خاناں اور ہندی شاعری کبیر داس، سور داس دکنی زبان کی شاعری کا آغاز سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۳ء-۱۶۱۱ء)
۱۶۵۰ء-۱۷۵۰ء	گولکنڈہ اور بیجاپور کی تباہی شیواجی اور مرہٹوں کا عروج، دہلی میں حکومتِ مغلیہ کا زوال محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ۔ نادر شاہ کا حملہ (۱۷۳۹ء) دہلی میں تاریکی اور بدامنی، بنگال اور مدراس میں انگریزی حکومت کا آغاز۔	اردو شاعری کا آغاز ولی دکنی (۱۶۶۸ء-۱۷۴۴ء) دہلی کی شاعری کا عروج شاہ حاتم (۱۶۹۹ء-۱۷۹۱ء) سودا (۱۷۱۳ء-۱۷۸۱ء) مظہر جانِ جاناں (۱۶۹۸ء-۱۷۸۱ء) فغاں، تاباں، درد (۱۷۱۰ء-۱۶۸۴ء) قائم چاندپوری (۱۷۳۰ء-۱۷۹۴ء) سوز (۱۷۱۸ء-۱۷۹۸ء) میر (۱۷۱۰ء-۱۸۱۰ء)

۱۷۵۰ء - ۱۸۰۰ء	پلاسی کی لڑائی (۱۷۵۶ء) نواب اودھ خود مختار بادشاہ بن بیٹھے۔ دربار لکھنؤ کا عروج۔ شاہانِ مغلیہ دہلی چھوڑتے ہیں۔ شاہ عالم بادشاہ اودھ کے زیر سایہ الہ آباد میں رہنے لگے (۱۷۵۹ء) پانی پت کی لڑائی (۱۷۶۳ء) مرہٹوں کی شکست بکسر کی لڑائی۔ انگریزوں کو شاہ عالم سے بنگال کی دیوانی ملتی ہے۔ شاہ عالم مرہٹوں کی مدد سے دہلی واپس آتے ہیں۔ (۱۷۷۲ء) غلام قادر کی بغاوت۔ شاہ عالم اور ان کے خاندان پر مظالم (۱۷۸۸ء) جنرل لیک دہلی فتح کرتے ہیں۔ انگریزوں کا دہلی پر قبضہ۔ مرہٹوں کی شکست۔	میر حسن (۱۷۲۷ء-۱۷۸۶ء) سودا، میر تقی میر، میر حسن اور دوسرے شعرا دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوگئے۔ نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۵ء-۱۸۳۰ء) لکھنؤ کی شاعری کا پہلا دور دیوانہ، حسرت، جرأت (۱۷۴۵ء-۱۸۱۰ء) پروانہ۔ مصحفی (۱۷۴۹ء-۱۸۲۴ء) انشا (۱۷۵۳ء-۱۸۱۷ء) رنگین (۱۷۵۵ء-۱۸۳۵ء)
۱۸۰۰ء - ۱۸۷۰ء	دربار اودھ کا عروج	ا۔ لکھنؤ کی شاعری کا عروج ناسخ (۱۷۷۴ء-۱۸۳۸ء) آتش (۱۷۶۷ء-۱۸۴۷ء) گویا (۱۷۸۰ء-۱۸۵۸ء)

	بادشاہ اودھ کی معزولی (۱۸۵۶ء)	اختر (۰۰۰۰۰ - ۱۸۵۸ء)
	ہنگامۂ غدر اور لکھنؤ کی تباہی (۱۸۵۷ء)	۲- مرثیہ گوئی کا عروج
		میر انیس اور مرزا دبیر
		۳- دہلی کی شاعری کا آخری عہد زریں
		شاہ نصیر- (۱۷۶۵ء-۱۸۴۰ء)
		ذوق- (۱۷۸۹ء-۱۸۵۴ء)
		مومن- (۱۸۰۰ء-۱۸۵۱ء)
		غالب- (۱۷۹۶ء-۱۸۶۹ء)
		شیفتہ- (۱۸۰۶ء-۱۸۶۹ء)
		ظفر- (۱۷۷۵ء-۱۸۶۲ء)
		۴- لکھنؤ کی شاعری کا آخری دور دیگر شاگردان مصحفی
		اسیر- (۱۸۰۰ء-۱۸۸۱ء)
		ہوس- عیشی- غافل- شہیدی-
		۵- شاگردانِ ناسخ و آتش
		وزیر- (۱۷۹۵ء-۱۸۵۴ء)

		رند- (۱۷۹۷ء-۱۸۵۵ء) صبا- (۱۷۹۳ء-۱۸۵۵ء) نسیم (دیا شنکر) (۱۸۱۲ء-۱۸۴۴ء) نسیم دہلوی- (۱۷۹۴ء-۱۸۶۴ء) قلق- (..... - ۱۸۸۰ء) امانت- (۱۸۱۵ء-۱۸۸۶ء) مُنیر شکوہ آبادی (۱۸۱۹ء-۱۸۸۶ء) اختر- واجد علی شاہ (۱۸۲۷ء-۱۸۸۷ء)
اُنیسویں صدی کا آخر	انگریزی حکومت کا عروج انگریزی تعلیم کے تاثرات سر سید احمد خاں اور علی گڈھ کی تحریک دربار رامپور اور دربار حیدرآباد	۱- دہلی کی شاعری کا آخری دور شاگردانِ ذوق- مومن و غالب مجروح- (۱۸۳۵ء-۱۹۰۲ء) زکی- (۱۸۳۹ء-۱۹۰۳ء) سالک- (۱۸۲۹ء-۱۸۹۳ء) ظہیر- (۱۸۳۹ء-۱۹۱۱ء) حالی- (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) آزاد- شبلی-

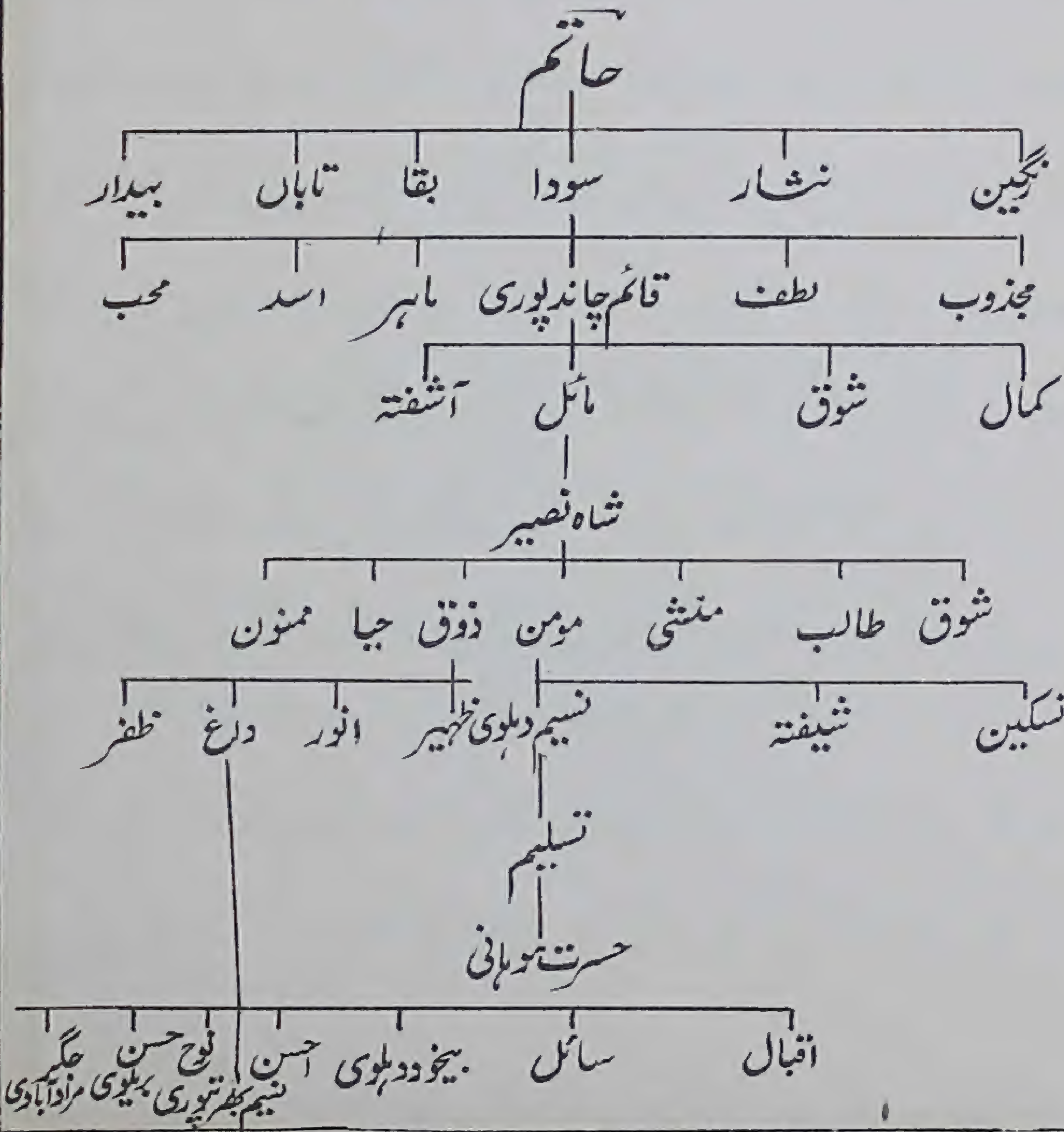
بیسویں صدی	جنگِ عظیم اور ہندوستان میں تحریکِ آزادی - انگریزی تاثرات سے بیزاری	۲- پرانی شاعری کا آخری دور وحید- (۱۸۲۹ء-۱۸۹۲ء) امیر مینائی- (۱۸۲۸ء-۱۹۰۱ء) داغ- (۱۸۳۱ء-۱۹۰۵ء) جلال- (۱۸۳۵ء-۱۹۰۹ء) تسلیم- (۱۸۲۰ء-۱۹۱۱ء) حسن بریلوی- نسیم بھرت پوری اکبر الہ آبادی- (۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء) چکبست- (۱۸۸۲ء-۱۹۲۶ء) مرزا رسوا- (۱۸۵۷ء-۱۹۲۱ء) شاد عظیم آبادی- (۱۸۴۶ء-۱۹۲۷ء) ریاض خیر آبادی- (۱۸۵۳ء-۱۹۳۵ء) اصغر گونڈوی- (۱۸۸۴ء-۱۹۳۶ء) آرزو- (۱۸۷۲ء-۱۹۵۱ء) حسرت موہانی (۱۸۷۵ء-۱۹۵۱ء) فانی- سائل- جلیل- یاس و یگانہ سیماب- ناطق- وحشت

سِلسلۂ تلمّذ

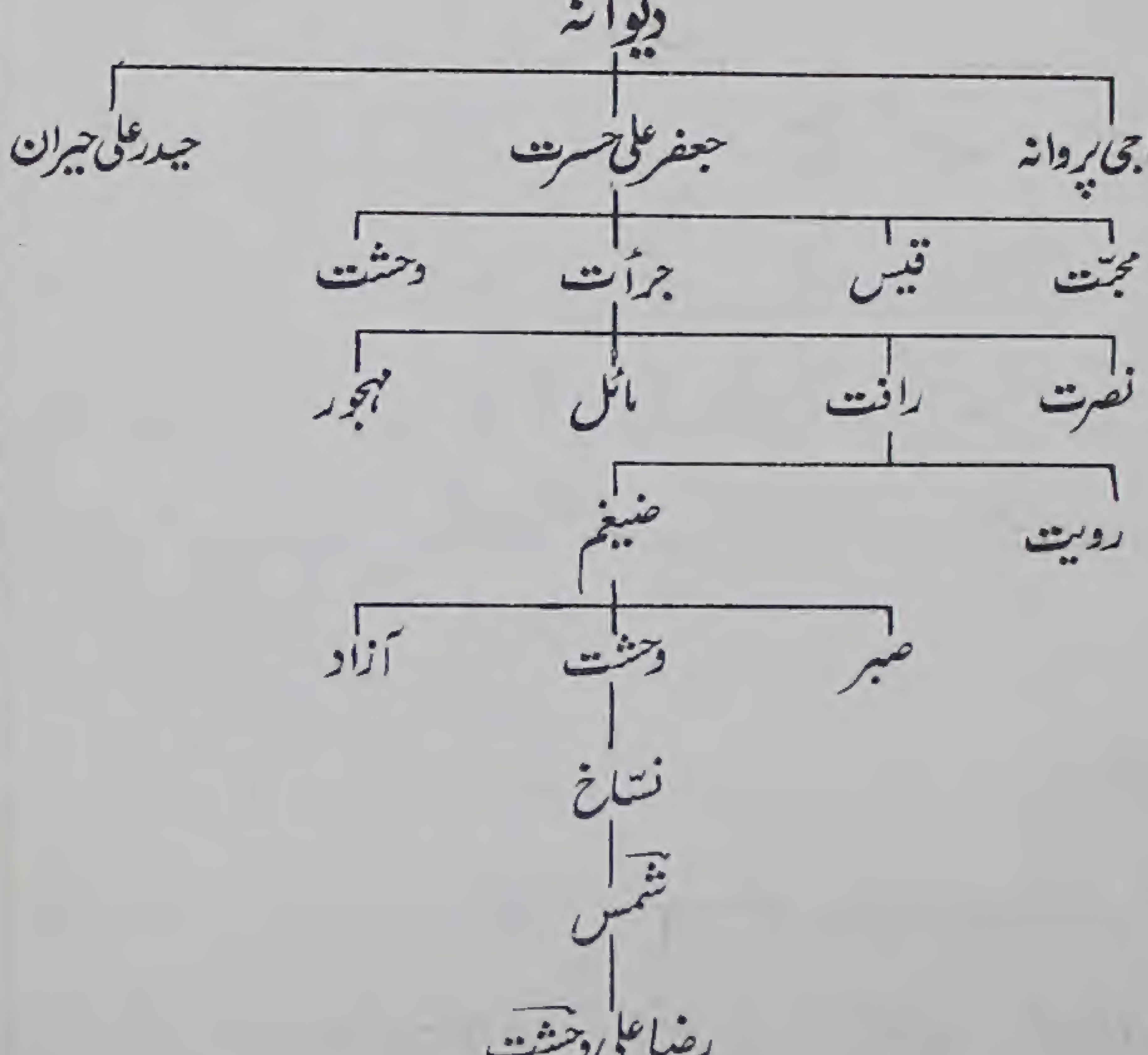
اُردو شاعری میں استاد و شاگرد کا سلسلہ ایک بالکل نئی چیز ہے۔ جہاں تک معلوم ہے کسی دوسرے ادب میں یہ رواج اس شکل میں قائم نہیں ہوا۔ غالبًا اس کی وجہ یہ تھی کہ زبان نئی تھی۔ اس کے قواعد و ضوابط مستند کتابوں میں نہیں پائے جاتے تھے۔ اس لئے اسکی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہر نیا شاعر اپنے لئے ایک رہنما تلاش کرے۔ رفتہ رفتہ ایک ایسی مستقل روایت بن گئی۔ ذیل میں شاہ حاتم۔ سرب سکھ دیوانہ اور مصحفی کے تلامذہ کے سلسلہ درج کئے جاتے ہیں۔ جن سے آپ دیکھیں گے کہ ان بزرگوں کا فیض سلسلہ بہ سلسلہ آج تک چلا آرہا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُستادی شاگردی کے رواج کے باعث شعراء کے ذاتی جوہر پورے طور پر ظاہر نہیں ہونے پائے۔ شاگرد اکثر استاد ہی کے قدم بہ قدم چلتے رہے، اور اپنے لئے نئے راستے نہیں نکالے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اکثر اساتذہ نے اپنے فرائض بڑی خوبی سے انجام دئے، اور شاگردوں کو اُن کے مخصوص رجحان کے لحاظ سے ترقی کرنے میں پوری مدد دی۔ بہت سے شعرا کا رنگ رفتہ رفتہ اپنے استادوں سے بالکل علحدہ ہو گیا۔ مثلاً حاتم کے شاگرد سودا۔ مصحفی کے شاگرد آتش۔ تسلیم کے شاگرد حسرت موہانی اور داغ کے شاگرد اقبال۔ جہاں تک معمولی استعداد کے شعرا کا تعلق ہے یہ بغیر استاد کے کہیں کے بھی نہ ہوتے، اور اگر انہوں نے کوئی نیا راستہ نہیں نکالا تو کوئی تعجب نہیں۔

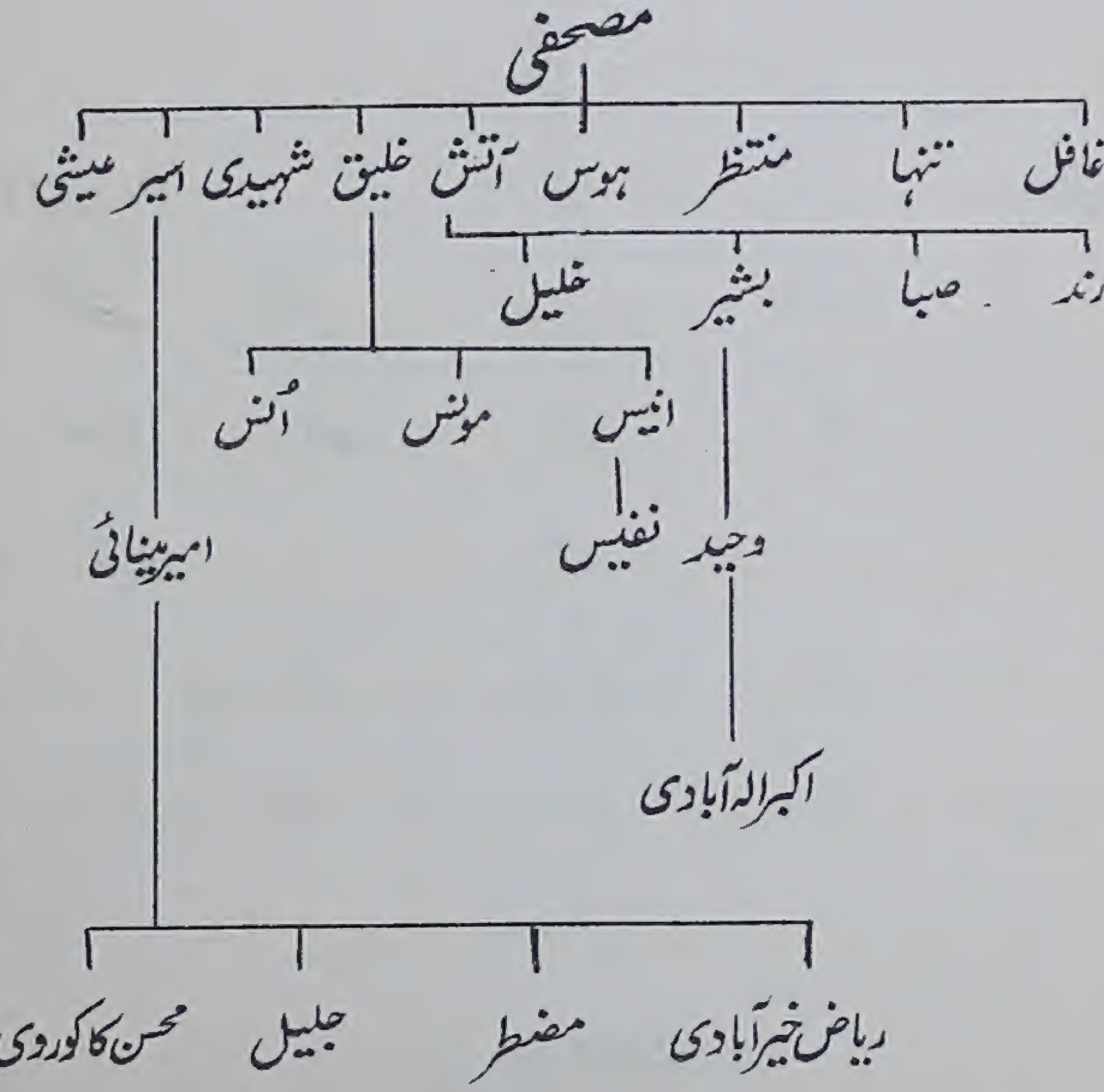
سلسلۂ تلامذۂ شاہ حاتم



سلسلۂ تلامذہ سرب سکھ دیوانہ



سلسلۂ تلامذۂ مصحفی



مُشاعِرے

سلسلۂ تلمّذ کی طرح مشاعروں کا رواج بھی اردو شاعری کی ایک خصوصیت رہا ہے۔ آجکل مشاعروں میں عموماً ٹکٹ لگتے ہیں اور مشاعرے چندہ جمع کرنے کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں۔ لیکن کسی زمانہ میں ان جلسوں کی حیثیت صرف ادبی محفلوں کی تھی۔ مشاعروں کے آداب بڑے سخت ہوتے تھے۔ اساتذہ کا کلام بڑی عزت و احترام سے سُنا جاتا تھا۔ اور نئے شعرا کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ساتھ ساتھ اس بات کے لئے تیار رہتے تھے کہ اگر کوئی سرِ محفل اعتراض کر بیٹھے تو اُس کے جواب میں برجستہ سند پیش کر سکیں۔

مشاعرے طرحی ہوتے تھے اور عموماً ہر مشاعرے کے لئے نئی غزل کہنا ضروری

تھا ۔ فرحت اللہ بیگ نے اپنے مضمون " دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ ۱۲۶۱ھ " میں ایک غیر طرحی مشاعرے کا حال لکھا ہے۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک ہی طرح میں اتنے شعرا کی غزلیں ملنا ناممکن تھا۔ کبھی کبھی طرح کے علاوہ مشاعرہ میں موضوع کی قید بھی لگا دی جاتی تھی۔ دہلی کے آخری دور کے شعرا کے انتخاب میں آپ چند غزلیں دیکھیں گے جو ایک ہی طرح میں ہیں اور سب دہلی کی تباہی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ غالباً یہ کسی مشاعرہ میں پڑھی گئی تھیں ۔

مشاعروں کے باعث شعرا کے علاوہ سننے والوں میں بھی شاعری اور ادب کا ذوقِ سلیم پیدا ہو گیا۔ شاید عرب کے علاوہ اور کسی ملک کے عام لوگوں کی زبان میں وہ فصاحت اور شیرینی نہیں پائی گئی جو لکھنؤ اور دہلی کے باشندوں کی ایک خصوصیت رہی ہے ۔ عرب میں اگرچہ مشاعرے نہ ہوتے تھے لیکن عام مجمع میں لوگ اپنا کلام پڑھ کر سناتے تھے ۔ ممکن ہے اسی رواج نے ہندوستان میں رفتہ رفتہ مشاعروں کی شکل اختیار کر لی ہو۔

اُردو شاعری کی ترقّی میں درباروں کا حِصّہ

شاہانِ گولکنڈہ و بیجاپور: اگرچہ اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی لیکن دہلی والے جنہوں نے اس فن کو کمال تک پہونچا دیا دکنی شعرا کی کوششوں کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ؎

قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک چیز لچر سی بہ زبان دکنی تھی

گولکنڈہ کے کئی بادشاہ خود شاعر تھے۔ اور شاعروں کے قدردان۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلیات شاید زبانِ اردو کی پہلی تصنیف ہے۔ جواب مکمل صورت
(۱۵۸۰ء-۱۶۱۱ء)

ہیں موجود ہے۔ ان کے کلام پر ہندی شاعروں کا اثر غالب تھا۔ محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھے۔

گولکنڈہ کے دربار میں ابن نشاطی، غواصی اور وجہی تھے۔ جن کی تصانیف زبان اردو کے اوّلین نمونوں میں سے ہیں۔

بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ (۱۵۸۰ء-۱۶۲۶ء) اور علی عادل شاہ دوم کے زمانہ میں علم و ادب کا چرچا تھا۔ اوّل الذکر کے دربار میں فارسی کے مشہور مصنف ظہوری بھی تھے۔ جنہوں نے بادشاہ کی لکھی ہوئی موسیقی کی کتاب کی تمہید لکھی جو "سہ نثر ظہوری" کے نام سے مشہور ہے اور اصل کتاب سے کہیں زیادہ مقبول ہوئی۔

شاہانِ دہلی : اردو شاعری کے عروج کے وقت دہلی کی سلطنت تباہ ہو چکی تھی۔ لیکن آخری شاہانِ مغلیہ باوجود اپنی مجبوریوں کے علم و ادب کی پرورش کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض خود شاعر تھے اور ان کے دربار میں دہلی کے اکثر نامور شعرا جمع

رہتے تھے۔

شاہ عالم ثانی کے دیوانِ اردو اور دیوانِ فارسی دونوں موجود ہیں۔ ایک افسانوی مثنوی مضمونِ اقدس، اور وہ قصیدہ جس میں غلام قادر کے مظالم کا تذکرہ ہے مشہور ہیں۔ ان کے دو صاحبزادگان اکبر شاہ ثانی اور مرزا سلیمان شکوہ بھی شاعر تھے جن میں سے آخر الذکر کا قیام عرصہ تک لکھنؤ میں رہا، جہاں مصحفی، انشا اور دوسرے شعرا کی سرپرستی فرماتے رہے۔

دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اردو کے مشہور شعرا میں سے تھے۔ ان کا کلام پاکیزہ ہے جس میں تصوّف اور اخلاق کے مضامین نہایت خوبی سے بیان کئے گئے ہیں۔

دربارِ اودھ : دہلی کی تباہی کے بعد اکثر شعرا نے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ شاہان اودھ علم و ادب کے قدردان تھے۔ ان میں سے اکثر خود شاعر تھے۔ نواب آصف الدولہ جو اپنی تعمیرات اور سخاوت کے لئے مشہور

ہیں، آصف تخلص کرتے تھے، اور میر سوز سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ کلام صاف اور شستہ ہے ؎

جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں
خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں

ان کے صاحبزادے وزیر علی جو جلد ہی سلطنت سے معزول کر دئے گئے تھے۔ شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کا ایک قطعہ حسب حال مشہور ہے ؎

جوں سبزہ رندے اُگتے ہی پیروں کے تلے ہم
اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم

نواب سعادت علی خاں۔ غازی الدین حیدر۔ نصیر الدین حیدر اور دوسرے بادشاہ بھی اسی طرح شاعری سے ذوق رکھتے تھے۔ لیکن آخری بادشاہ واجد علی شاہ جو افسوس ہے کہ اپنی غفلت اور اُس زمانہ کے حالات کے زیر اثر حکومت سے ہاتھ

دھونی بیٹھے۔ فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ دخل رکھتے تھے۔ موسیقی کے علم سے پوری طرح واقف تھے۔ شاعری میں امیر کے شاگرد اور اختر تخلص کرتے تھے۔ غزلوں کے علاوہ ایک مثنوی حزنِ اختری، جس میں اپنے مصائب بیان کئے ہیں۔ اور کچھ مرثیے مشہور ہیں۔ ایک رسالہ جوہرِ عروض بھی اِن کے نام سے منسوب ہے۔ ایک مدت کلکتہ میں بسر کرکے وہیں انتقال کیا ؎

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں
لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

رامپور: جب لکھنؤ میں شعر و شاعری کے قدر دان مِٹ گئے تو داغ اور امیر مینائی نے محفلِ سخن رامپور اور حیدر آباد میں آراستہ کی۔ دہلی کی قربت کے باعث رامپور میں پہلے ہی علم و ادب کا چرچا تھا۔ نواب یوسف علی خاں (وفات ۱۸۶۵ء) ناظم تخلص کرتے تھے۔ پہلے حکیم مومن خاں اور پھر مرزا غالب

سے اصلاح لیتے تھے۔ان کا کلام پاکیزہ ہے۔جس سے ان کی خوش ذوقی کا پتہ چلتا ہے۔

نواب کلب علی خاں نواب امیر مینائی سے اصلاح لیتے تھے

ے

بھلا کیا خاک سوئے چین سے وہ کنج مرقد میں
رہا ہو جس کے سر کا تکیہ دوشِ نازنیں برسوں

عجب حسرت سے دیکھا ہے سوئے جاناں دمِ آخر
رہے گی یاد اس کو بھی نگاہِ واپسیں برسوں

ہوئے ہوں گے کسی سے وصل کے اقرار بھی شاید
رہی ہم سے تو اس بے رحم کافر کی نہیں برسوں

نصیبوں میں جو لکھی ہے برائی وہ نہ جائے گی
اگر رگڑوں گا در پر کعبہ کے نقشِ جبیں برسوں

اس زمانے میں رامپور میں بڑے بڑے مشاعرے ہوتے تھے جن میں تمام ہندوستان کے شعرا جمع ہوا کرتے تھے۔

حیدرآباد:۔ اردو ادب دکن سے شروع ہوا تھا اور انگریزوں کی حکومت کے زمانہ میں جب ملک کے دوسرے حصّوں میں اس کی خاطر خواہ پرورش نہ ہوئی تو بالآخر اس نے دوبارہ دکن ہی میں پناہ لی۔ میر محبوب علی خاں خود شاعر تھے، اور علم و ادب کے بڑے قدردان۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ کے ذریعہ زبان اردو نے جو ترقی کی اس سے سب واقف ہیں۔ انجمن ترقیٔ اردو کا قیام بھی ایک عرصہ تک حیدرآباد ہی میں رہا۔ اس کے زیرِ اہتمام بہت سی پرانی نایاب کتابیں شائع ہوئیں۔ داغؔ جلیلؔ اور آخر میں جوشؔ ملیح آبادی جیسے شعرا کے قیام سے اس محفل کی رونق قائم رہی۔ داغؔ کے شاگرد ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے، اور اُن کے ذریعہ اردو شاعری کو جو فروغ حاصل ہوا وہ کسی بیان کا محتاج نہیں۔

لکھنؤ، رامپور اور حیدرآباد کے علاوہ فرخ آباد، مرشد آباد۔ ٹونک عظیم آباد

الور، منگرول اور بہت سی چھوٹی ریاستوں میں اور اُمرا، اور تعلقہ داروں کے یہاں شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ غدر کے بعد دہلی کے اربابِ کمال کو جہاں جگہ ملی اور کوئی قدردان مل گیا وہیں رہ گئے ؎

دلّی بگڑ کے بن گئیں اکثر ولایتیں
جس گھر میں دیکھو لوٹ اسی اجڑے گھر کی ہے

(مُنیرؔ)

۶۔ اُردُو غزل کی خصوصیات

سید انشا "دریائے لطافت" میں غزل کی تعریف اس طرح کرتے ہیں :۔

"غزل اُس کلامِ موزوں سے عبارت ہے کہ اس کی پہلی بیت مقفّٰی ہو جسے مطلع کہتے ہیں۔ باقی شعر اس قبیل سے ہوں کہ بیت کا دوسرا مصرع مطلع کا ہم قافیہ ہو۔ یہ سب جانتے ہیں۔ اہلِ عجم کا قاعدہ ہے غزل کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلّص ڈالتا ہے۔ اس کو مقطع کہتے ہیں"۔

اکثر غزل کے تمام اشعار ایک لفظ پر ختم ہوتے ہیں۔ اس کو ردیف کہتے ہیں۔ لیکن یہ قافیہ کی طرح ضروری نہیں۔

غزل کے مضامین کے بارے میں سید صاحب فرماتے ہیں :۔

"غزل میں معشوق، شراب، فراق کے الم کا شکوہ، اور معشوق کی جفاؤں اور بُری عادتوں کے سوا اور مضامین کا ذکر زیبا نہیں۔ جو اس کے خلاف ہو وہ

غزل نہیں۔ لوگوں کے تصرّفات غیر معتبر ہیں، اور جن لوگوں نے بیوقوفوں پر رنگ جمانے اور صاحبِ طرزِ جدید بننے کا لقب حاصل کرنے کے واسطے غزل کو معمّا بنا دیا ہے ان کا کلام غیر فصیح ہے۔ وُہ نافہموں میں مقبول اور مشہور رہوں لیکن عقلمندوں کے نزدیک معتبر نہیں۔"

آگے چل کر صاف کہہ دیتے ہیں کہ غزل کا معشوق عورت نہیں ہوتا اور اگر کوئی شخص "آیا وُہ دلربا" کی جگہ "آئی وُہ دلربا" کہے تو محض غلط ہے۔

سیّد صاحب کے مُنہ کون لگ سکتا تھا لیکن واقعہ یوں ہے کہ اردو غزل کا معشوق صرف ایک حسین وجمیل انسان ہے۔ خواہ وُہ مرد ہو یا عورت ؎

دیکھا نہیں کسی نے اس یارِ نازنیں کو
لیکن یہی سُنا ہے بے انتہا حسیں ہے (اکبر)

شکسپیئر کے معشوق کے بارے میں مدّت سے ایسی ہی بحث چھڑی ہوئی ہے اور آج تک مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

غزل کے اشعار کی تعداد پانچ سے کم نہیں ہونا چاہئے۔ زیادہ کی کوئی حد معین نہیں۔ عموماً سات یا نو یا گیارہ یا اور کوئی طاق عدد رکھتے ہیں۔

شعر کی ایک خاص کشش اُس کی موزونیت ہے اور اسی لئے عروض وقافیہ کے قیود لگائے گئے ہیں۔ ان قواعد وضوابط سے جتنی آزادی حاصل کر لیجئے۔ اُسی قدر خراب شعر کہنا آسان اور اچّھا شعر کہنا مشکل ہو جائے گا۔ جس طرح موسیقی سے اس کے قیود وبند ہٹا دیجئے تو اس کی حیثیت معمولی شور وشغب سے زیادہ نہ رہے گی۔

عام طور سے غزل کے ہر شعر میں ایک علیٰحدہ مضمون نظم کیا جاتا ہے اور شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس مختصر عبارت میں کوئی لطیف بات کہہ جائے۔ قادر الکلام شاعر کو قافیہ اور ردیف کی پابندیوں سے کوئی خاص دقّت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کا ذہن بہت جلد ایسے خیالات کا انتخاب کر لیتا ہے جو ان تعینات کے ساتھ نظم کئے جاسکیں۔ بعض اوقات ایک غزل کے تمام اشعار میں مضمون کا ربط اور خیالات کا ایک سلسلہ پایا جاتا ہے۔ اور اس مجموعہ میں آپ کو متعدّد غزلیں اس قبیل کی بھی

ملیں گی۔

اچھے شعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ مضمون میں کوئی رنگینی یا لطافت ہو، اور بندشیں اور الفاظ خوبصورت اور مناسب ہوں۔ ایک شعر کے ذریعہ ایک مکمل خیال کی تصویر ذہن میں آجائے۔ نئے خیالات یا انوکھی باتیں دنیا میں بہت کم کہی جاتی ہیں۔ صرف اردو شاعری ہی پر موقوف نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی کلام کی خوبی زیادہ تر اندازِ بیاں پر منحصر ہے۔ مشاعروں کے ذریعہ اور اساتذہ کے فیض سے ہمارے یہاں معمولی ذہانت اور استعداد کے شعرا کثیر تعداد میں پیدا ہو گئے جن کا کلام بیشک ادنیٰ درجہ کا ہے اور جن کے یہاں اندازِ بیان کی خوبیاں بھی کم پائی جاتی ہیں لیکن اس بات کا خیال کرتے ہوئے کہ اردو شاعری کی عمر صرف دو سو ۲۰۰ سال کی ہے۔ کافی تعداد اچھے شعرا کی ملتی ہے۔ جن کے کلام کا اعلیٰ نمونہ دنیا کے بہترین ادب کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ جرأت، داغ اور ریاض جیسے شاعر بھی گذرے ہیں۔ جن کا کلام بلند ترین ادب میں شمار کئے جانے کے قابل نہ سہی لیکن لطفِ بیان

کے باعث بہت زیادہ مقبول ہوا۔ آج دنیا کی دوسری زبانوں کی کتابیں جو ہزاروں کی تعداد
میں چھپتی رہتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر ایسی ہیں جو دوسرے کیا تیسرے درجہ کے ادب میں بھی
شمار نہیں کی جاسکتیں۔ ہم میں سے اکثر ان کتابوں کو خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ پھر اردو
زبان کے اوسط درجہ کے شعرا کے کلام پر کیوں منہ بنائیں۔

اردو شاعری پر ایک خاص اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں مناظرِ قدرت،
درختوں، جانوروں اور ایسی دوسری نیچرل چیزوں کا ذکر بہت کم پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ
یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہمارا تمدن شہری ہے۔ اس ملک میں ادب اور شاعری دہلی، لکھنؤ،
حیدرآباد اور دوسرے بڑے شہروں سے وابستہ رہے ہیں۔ اس لئے یہاں اگر ورڈزورتھ
نہ پیدا ہوا تو کوئی تعجّب نہیں۔ میر حسنؔ اور میر انیسؔ نے اپنے کلام میں مناظرِ قدرت کو
بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔ یہ مان لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ ان صاحب کمالوں
نے جہاں صبح کا سماں یا چاندنی رات کا منظر بیان کیا ہے وہ ایک حد تک خیالی اور
فرضی ہے۔ ہر ایک زبان کی شاعری اپنے ماحول کے لحاظ سے ترقی کرتی ہے۔ ہمارے

شعرا نے انسان کے جذبات اور خیالات کی تصویریں لاجواب کھینچی ہیں وُہ کیا کم ہیں ؎

ہماری سیر کو گلشن سے کوئے یار بہتر تھا
نفیر بلبلاں سے نالہائے زار بہتر تھا (ذوقؔ)

اکثر عاشقانہ مضامین کے پردہ میں بھی فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔ ظالم سے ہمیشہ معشوق ہی مراد نہیں ہوتا۔ رقیب صرف عاشقی ہی میں نہیں پیدا ہوتے۔ ہجر و وصال سے اکثر صرف بُرے دن اور اچھے دن مقصود ہوتے ہیں ؎

جیا جو ہجر میں سو وصل یار دیکھے گا
جو اس خزاں سے بچے گا بہار دیکھے گا
(داغؔ)

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے
(غالبؔ)

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بُلبل
کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صورت
(حالیؔ)

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام　　　　وُہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

(اکبرؔ)

بیقراری تھی سب اُمید ملاقات کیساتھ　　　　اب وُہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

(حالیؔ)

معشوق کو ظالم کہنا صرف ایک اندازِ بیاں ہے۔ یہ نہیں کہ وُہ واقعی سر کاٹنے کے لئے تیار رہتا ہے ؎

مطلب ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر　　(غالبؔ)

داغؔ و ریاضؔ خیرآبادی اکثر اپنے معشوق کو سخت و سُست کہہ دیتے تھے لیکن اکثر شعرا کے نزدیک یہ اندازِ کلام نازیبا ہے ؎

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہیں مُنصفی سے کہدو تمہیں اعتبار ہوتا　　(داغؔ)

بیخود موہانی کہتے ہیں کہ اس شعر میں اردو شاعری کی روایات کے مطابق مناسب موقع الفاظ استعمال نہیں ہوئے اس لئے کہ معشوق کو جھوٹا یا غیر منصف کہنا قطعاً جائز نہیں۔ مناسب الفاظ ہوتے تو اس مضمون کو یوں ادا کیا جاتا ؎

مری جاں، جو تم سے کوئی کبھی ایسے وعدے کرتا

تمہیں اپنے دل میں سوچو تمہیں اعتبار ہوتا؟

جس زمانہ میں اردو شاعری نے نشو و نما پائی معشوق اکثر پردہ نشین ہوتے تھے اور رسم و رواج کی سختیوں کے باعث عاشق و معشوق کی ملاقات میں بڑی دشواریاں حائل ہوتی تھیں۔ اِن حالات میں سچّے عاشقوں کی قسمت میں رونا ہی رونا رہتا تھا ؎

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبّت میں

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا (میرؔ)

کوئی کوئی مومنؔ اور جراتؔ کی طرح اپنا دل ایسی جگہ لگا لیتے تھے جہاں کامیابی کی اُمید پائی جا سکتی تھی۔ ان کے کلام میں عشق و عاشقی کے "روزمرّہ" کے

معاملات بیان کئے گئے ہیں لیکن زیادہ تعداد ایسے شعرا کی ہے جن کے یہاں محض خیالی عاشقانہ مضامین باندھے گئے ہیں۔ ان کی سادہ زندگی میں عشق و محبت کی رنگینیاں کہاں۔ اس قسم کی شاعری مضمون نگاری کے زمرہ میں آتی ہے۔ اور کوئی تعجب نہیں اگر اس کا رنگ کسی قدر پھیکا ہے۔

یہی حال بادہ و ساغر کے مضامین کا ہے۔ بہت کم شعرا شراب پیتے تھے۔ اسلئے اس کا ذکر بھی اکثر خیالی ہوتا ہے۔ ریاض خیرآبادی جو خود شراب پیتے ہی نہ تھے اپنی غزلوں میں خم پر خم لنڈھاتے رہتے تھے۔ لیکن کہیں کہیں اصل مفہوم بیان کر جاتے ہیں ؎

ہے ریاض اک جوانِ ست خرام ۔۔۔ نہ پیئے اور جھومتا جائے

کبھی شراب کے "نشہ" سے صرف "اک گونہ بیخودی" مراد ہوتی ہے۔ عاشقانہ مضامین اور خمریات دونوں کے پیرایہ میں اکثر تصوف کے مضامین بیان کئے جاتے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۔۔۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر (غالب)

سولہویں اور سترہویں صدی کی انگریزی شاعری کی طرح پُرانی اردو شاعری کی دنیا بھی بہت محدود تھی۔ گل وبلبل، رقیب وہمنشیں، شمع وپروانہ، قفس وصیاد کے مضامین سے اگر آپ تنگ آجائیں تو کوئی تعجب نہیں۔ لیکن اچھے شعرا نے اکثر اوقات ان پامال تشبیہوں اور استعاروں کو بھی بڑی خوبی سے باندھا ہے ؎

جو پوچھو تو عزیزاں دل سے پوچھو یا کہ تم ہم سے
ہماری اور اُس کی بات اغیاروں سے مت پوچھو
گُلوں کو کب خبر ہے حالِ زارِ عندلیباں سے
حقیقت مفلسوں کی آہ، زرداروں سے مت پوچھو (میر حسن)

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی (غالب)

ہمیشہ منع تو کرتا تھا باغ سے ہم کو   سو حال اب گل وگلشن کا باغباں دیکھا (قائم)

کسی نے اُف بھی نہ کی شمع جل کے خاک ہوئی
نہ ہوئیگی مگر، آتش، یہ انجمن مٹّی (آتش)

اگر کبھی شاعر شوخی و شرارت کے رنگ میں ہوتا ہے تو اُس کی زبان سے ایسی باتیں بھی نکل جاتی ہیں جن کو بعض حضرات "ابتذال" اور "پست خیالی" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ اپنے اپنے مزاج کے مطابق سب کے یہاں کم و بیش یہ عنصر پایا جاتا ہے۔ جرأت انشاء اور رنگین کے یہاں نسبتاً زیادہ ہے۔ مومن کی غزلوں میں نہیں لیکن مثنویوں میں کہیں کہیں انتہائی شوخ رنگ بھرے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی ثقہ و پرہیزگار مصحفی بھی سفنی کے سرخ لباس پر قطعہ لکھ ڈالتے ہیں کسی وقت میر تقی میر عطار کے لڑکے کی تعریف میں ایسا شعر سُنا دیتے ہیں کہ بعض تنقید نگاروں کو اُن کے اخلاق و عادات کی بابت طرح طرح کے شکوک پیدا ہو جاتے ہیں۔ مرزا غالب باوجود فلسفی ہونے کے کبھی یوں بھی فرماتے ہیں ؎

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

رنگین و انشا کو بیگمات کی زبان کچھ ایسی پسند آئی کہ یہ اُس کو لے اُڑے۔ اور پھر عورتوں کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کرنے بیٹھے تو الامان! ان کی بعض بعض غزلیں ایسی ہیں کہ یقیناً مخصوص محفلوں کے لئے لکھی گئی ہوں گی۔ دیوان میں چھاپنے کے لئے نہیں، سُنا گیا ہے کہ اسی طرح بیسویں صدی کے بعض مشاہیر شعرا کا "غیر مطبوعہ" کلام بھی موجود ہے۔ جو چند خوش قسمت لوگوں نے اُن کی زبانی سُنا ہے۔ دراصل شعرا کی شوخیوں کو بداخلاقی اور ابتذال کے نام سے یاد کرنا نا انصافی ہے۔ خصوصاً جبکہ ہماری ادبی تاریخ کی کم مائگی کے باعث ان بزرگوں کے ذاتی حالات ہم تک بہت کم پہونچے ہیں۔ اس کے علاوہ اخلاقیات اور ادب کے تعلق کا معاملہ ایسا نازک ہے کہ اس بحث میں پڑنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا ہے۔

شاعری جذبات اور تاثرات کی دنیا ہے۔ شعرا کی غزلیں اُن کے خیالات و احساسات کا آئینہ ہیں۔ کبھی عشق ومحبت کی باتیں ہیں، کبھی دوستوں سے شکوے۔ کبھی دشمنوں سے بیزاری۔ اکثر اپنی بدقسمتی پر رونا ہے۔ اپنی حماقتوں پر ملامت۔ اور بعض اوقات

محض "ایک عنایت کی نظر" پر انتہائی خوشی و شادمانی۔ زمانہ کے افکار اور سوسائٹی کی بندشوں کے باعث عام انسانوں کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ اپنی روزانہ کی زندگی میں حسن و عشق کی رنگینیوں کو زیادہ جگہ دے سکیں۔ لیکن بلاشبہ ان کی دلآویزی ہر ایک پر اثر کرتی ہے۔ غزل کی شاعری کی خاص کشش انہیں کیفیّات سے وابستہ ہے لیکن کاملینِ فن نے زندگی کے دوسرے تاثّرات کو بھی ایسی خوبصورتی سے نظم کیا ہے کہ صدہا سال کے وقفہ کے بعد آج بھی اُن کی تازگی میں فرق نہیں آیا ہے

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے

اگر ہوتا چمن اپنا، گُل اپنا، باغباں اپنا (مظہرِ جانِ جاں)

میں نے سوچا تھا کہ فریاد کروں حاکم سے

وُہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا (نظیر اکبر آبادی)

ساقیا، یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے (میر درد)

لگ گئے عیب سارے اُس کے ساتھ
یوں کہا جس کو مرد بنگی ہے (انشاء)

خدا کرے کہ نصیب اپنے ہو نہ آزادی
کدھر کے ہو جے، جو بے بال و پر رہائی ہو (میر)

ہمدم نہ مجھ کو قصّۂ عیش و طرب سُنا
مدت سے دل کچھ ایسے فسانے سے اُٹھ گیا (جرأت)

ہم اس طرح سے ہیں یارانِ رفتگاں سے دُور
غریب جوں کوئی رہ جائے کارواں سے دُور (جرأت)

دوستوں سے ہم نے وہ صدمے اُٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا (آتش)

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے (آتش)

برنگِ آئینہ انساں کی قسمت ہے اگر سیدھی
مُوافق ہے زمانہ، دوست دشمن کی نظر سیدھی (آتش)

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے، کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہونگے (مومن)

اے ذوقؔ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے (ذوقؔ)

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہُنر میں یکتا تھے
بے سبب ہُوا غالبؔ، دشمن آسماں اپنا (غالبؔ)

نفَس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ (غالب)

آشفتہ خاطری وُہ بَلا ہے کہ شیفتہؔ
طاعت میں کچھ مزا ہے، نہ لذّتِ گناہ میں (شیفتہؔ)

باغباں، دل میں بھری ہیں تری لاکھوں باتیں
آشیاں جا کے کہیں اور بنا لوں تو کہوں (ریاضؔ)

ناز کیا اس پہ زمانہ نے جو بدلا ہے تمہیں
مرد وُہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں (اکبرؔ)

جو غبارے تھے سو آخر گر گئے
جو ستارے تھے چمکتے ہی رہے (اکبرؔ)

٭

شعرا اور انتخابِ کلام

بابِ اوّل۔ پیش رو

خسروؒ

(۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۴ء)

ابو الحسن خسرو، آگرہ کے قریب ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سلطان التمش کے زمانہ میں بلخ سے ہندوستان آئے اور جلد ہی شاہی عہدہ داروں میں شامل ہو گئے۔ یہ خود بھی بلبن، کیقباد اور دوسرے بادشاہوں کے درباروں میں

اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

امیر خسرو بلاشبہ دُنیا کے صاحب کمالوں میں سے تھے۔ ان پر سرزمین ہند و پاکستان جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ فارسی اور ہندی دونوں کے بلند پایہ شاعر، بذلہ سنج، لطیفہ گو، فنِ موسیقی کے ماہر، عجیب خوبیوں کا مجسمہ تھے۔ ہندوستانی موسیقی کے کئی راگ اُن کے نکالے ہوئے ہیں۔ ستار کا مقبول ساز بھی کہتے ہیں انہیں نے ایجاد کیا۔ ساتھ ساتھ صاحبِ باطن ہونے کی حیثیت سے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خاص مقربوں میں سے تھے۔ مرنے کے بعد بھی حضرتِ محبوب الٰہی سے دور نہ ہوئے اور اُنہیں کے زیر سایہ دفن ہیں۔

میر تقی میرؔ "تذکرہ نکات الشعراء" میں فرماتے ہیں:۔

"حضرت امیر خسروؒ رحمۃ اللہ علیہ مجمع کمالات و صاحبِ حالات فضائل او اظہر من الشمس است۔ احوال امیر مذکور در تذکرہ ہا مسطور۔ نوشتن ایں احقر العباد فضولیست۔ اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد۔ در ایں خود تردد ے نیست۔ از انجملہ

یک قطعہ نوشتہ آید ؎

"زرگر پسرے چوماہ پارا　　کچھ گھڑیئے سنواریئے پکارا

نقدِ دلِ من گرفت وبشکست　　پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا"

یہ قطعہ حضرت امیر خسروؒ کی شوخیِ طبع کی مثال ہے۔ اردو کی پہلی غزل جس سے یہ مجموعہ شروع ہوتا ہے، انہیں کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ قطعہ اور غزل دونوں میں ہر شعر کا پہلا مصرع فارسی زبان میں اور دوسرا ہندی میں ہے۔ اور شاعری کی دُنیا میں دونوں زبانوں کا اتحاد پہلی مرتبہ نظر آتا ہے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دُرائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف دروزِ وصلت چو عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشمِ جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سُناوے پیارے پی کوں ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

:·:

ولی

(۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء)

شمس الدین محمد ولی۔ اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ احمد آباد میں تعلیم پائی۔ ابتدائی کلام اُس زمانہ کی دکنی زبان اور انداز میں ہے لیکن جب دہلی گئے تو ان کا اثر دہلی والوں پر اور دہلی والوں کا اثر ان پر بہت کچھ پڑا ؎

دل ولی کا لے لیا دِلّی نے چھین
جا کہے کوئی محمد شاہ سوں

دہلی میں اس وقت تک پڑھے لکھّے لوگ جو کچھ لکھتے تھے وہ فارسی میں لیکن ولی کا کلام سُن کر ان کے ہمعصروں نے اردو میں غزلیں کہنا شروع کیں۔ ساتھ

ساتھ وؔلی نے بھی دہلی کے صاحب کمالوں کی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی ابتدائی اور آخری زمانہ کی غزلوں میں زبان اور خیالات دونوں کا فرق نظر آتا ہے۔ اس انتخاب میں جو چند غزلیں پیش کی گئی ہیں اُن میں بھی آپ اس فرق کو نمایاں دیکھ سکتے ہیں۔ آخری دور کے بعض اشعار ایسے ہیں جو آج کا کلام معلوم ہوتے ہیں ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

وؔلی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریختہ کی زبان جو ابھی تک صرف بول چال میں استعمال ہوتی تھی، اُس کو وؔلی دکنی نے ادبی حیثیت کو پہونچایا۔

میر تقی میرؔ تذکرہ "نکات الشعرا" میں ان کے بارہ میں لکھتے ہیں :-

"از کمالِ شہرت احتیاجِ تعریف ندارد"

وُہ ناز میں ادا میں اعجاز ہے سراپا　　　خوبی میں گُل رخاں سوں مُمتاز ہے سراپا

اے شوخ تجھ نین میں دیکھا نگاہ کر کر	عاشق کے مارنے کا انداز ہے سراپا

گل ہے اے عیسوی دم یک بات لطف سیں کر	جاں بخش مجھ کوں تیرا آواز ہے سراپا

تجھ پر ولی ہمیشہ دلدار مہرباں ہے
ہر چند حسب ظاہر طنّاز ہے سراپا

⁂

جب صنم کوں خیال باغ ہوا	طالبِ نشّۂ فراغ ہوا

فوجِ عُشّاق دیکھ ہر جانب	نازنیں صاحبِ دماغ ہوا

مان سیں تجھ لباں کے سرخ ہوا	جگرِ لالہ داغ داغ ہوا

دلِ عُشّاق کیوں نہ ہو روشن	جب خیالِ صنم چراغ ہوا

اے ولی گلبدن کوں باغ میں دیکھ
دلِ صد برگ باغ باغ ہوا

⁂

جو آیا مست ساقی جام لے کر — گیا یک بارگی آرام لے کر
نگہ تیری سدا آتی ہے جیوں تیر — دلِ زخمی طرف پیغام لے کر
اُڑا آہوئے دل سوں رنگِ وحشت — جو آئی زلف تیری دام لے کر

*

تو ہے رشکِ ماہ کنعانی ہنوز — تجھکوں ہے خوباں میں سلطانی ہنوز
ہر جھلک دیتی ہے تجھ رُخسار کی — آرسی کو درسِ حیرانی ہنوز
شرم سوں تجھ مکھ کی اے دریائے حسن — چہرۂ گوہر پہ ہے پانی ہنوز
حلقہ زن ہے تجھ دہن کی یاد میں — خاتمِ دستِ سلیمانی ہنوز
رات کوں دیکھا تھا تیری زلف کوں — دل میں باقی ہے پریشانی ہنوز
روزِ اوّل سوں چمن میں حُسن کے — نئیں ہوا پیدا ترا ثانی ہنوز
جان جاتی ہے، ولے آتا نہیں — کیا سبب، وہ دلبرِ جانی ہنوز
اے ولی اُس گلبدن کے عشق میں — شغلِ بُلبل ہے غزلخوانی ہنوز

شراب شوق میں سرشار ہیں ہم — کبھو بے خود، کبھو ہشیار ہیں ہم
دو رنگی سوں تری اے سروِ رعنا — کبھو راضی، کبھو بیزار ہیں ہم
ترے تسخیر کرنے میں سرِ جن — کبھو ناداں، کبھو ہشیار ہیں ہم
صنم تیرے نین کی آرزو میں — کبھو سالم، کبھو بیمار ہیں ہم

وؔلی وصل و جدائی سوں سجن کی
کبھو صحرا، کبھو گلزار ہیں ہم

جسے عشق کا تیر کاری لگے — اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ چھوڑے محبّت دمِ مرگ تک — جسے یارِ جانی سوں یاری لگے
نہ ہوئے اسے جگ میں ہرگز قرار — جسے عشق کی بیقراری لگے
ہر اک وقت مجھ عاشقِ پاک کوں — پیارے تری بات پیاری لگے

وؔلی کوں کہے تو اگر یک بچن
رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے　　مرد کا اعتبار کھوتی ہے

کیونکہ حاصل ہو مجھ کوں جمعیت　　زلف تیری قرار کھوتی ہے

ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب　　مجھ انکھاں کا قرار کھوتی ہے

کیونکہ ملنا صنم کا ترک کروں　　دلبری اختیار کھوتی ہے

اے ولی آب اس پری رُو کی
میرے دل کا غبار کھوتی ہے

❊

غرورِ حسن نے تجھ کوں کیا ہے اسقدر سرکش　　کہ خاطر میں نہ لاوے تو اگر تجھ گھر ولی آوے

❊

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُس کو　　کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

❊

یک دل نہیں آرزو سوں خالی　　ہر جا ہے محال اگر خلا ہے

بَابِ دُوم، دہلی کی شاعری کا عُروج

(اٹھارہویں صدی کا آغاز)

جس زمانہ میں وَلی دکنی دہلی آئے حکومت مغلیہ زوال کی طرف مائل ہو چکی تھی۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کا نام ہی نام باقی تھا۔ ہر طرف خانہ جنگی پھیلی ہوئی تھی۔ چند سال کے اندر ہی اندر حکومت مغلیہ صرف دہلی کے علاقہ تک محدود رہ گئی۔ صوبہ دار خود مختار بادشاہ بن گئے۔ جن کے باپ دادا ملک گیری کرتے تھے وہ اب خود یا تو لیٹرے بن گئے یا پھر سے

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں (انشا)

اس انقلاب کے دور میں دہلی میں بڑے بڑے عالی دماغ موجود تھے لیکن ان کا زیادہ وقت دربار کی سازشوں میں گذرتا تھا۔ اتّفاق یہ کہ اردو شاعری اسی ہنگامی دور میں وُجود میں آئی اور باوجود زمانہ کے ناسازگار ہونے کے چند ہی سال میں پوری ادبی حیثیت حاصل کرلی۔ ترقی کی اس حیرت انگیز رفتار کی خاص وجہ یہ تھی کہ اردو شاعری کو سب کچھ ساز و سامان سجا سجایا فارسی زبان سے مل گیا۔ البتہ اس کا یہ اثر ہوا کہ استعارات و تشبیہات اکثر غیر ملکی استعمال ہوتے رہے۔

اس دور کے شعرا شاہ حاتم، میر، سودا، خواجہ میر درد اور میرحسن نے اپنے اپنے رنگ میں اردو شاعری کو درجۂ کمال تک پہونچا دیا۔ ان کے کلام میں وُہ صنّاعی اور زبان میں وُہ پختگی نہیں جو بعد کے شعرا کے یہاں پائی جاتی ہے۔ لیکن اُبلتے ہوئے چشموں اور قدرتی آبشاروں کی کیفیتیں نظر آتی ہیں جنہیں اردو شاعری کے

عنفوان شباب سے وابستہ سمجھنا چاہئے۔

شاہ حاتم سے دہلی کی شاعری کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس زمانہ کے اکثر مشاہیر ان کے شاگرد تھے۔ اور انہوں نے ایسا سلسلۂ تلمذ قائم کیا جو آج تک چلا آرہا ہے ؎

⁂

حاتم

(۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۱ء)

شاہ حاتم کو دہلی کی شاعری کا بانی کہا جاتا ہے۔ اُستادی شاگردی کا باقاعدہ سلسلہ انہیں سے شروع ہوا۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ یہ اپنے کلام کے لئے اُتنے مشہور نہ ہوئے جتنے اپنے شاگردوں کے لئے جن میں سے سودا، تاباں، بقا، اثر اور رنگین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا سلسلۂ تلمذ اقبال اور حسرت موہانی تک چلا آیا ہے۔ (شجرہ دیکھئے صفحہ ۱۲ پر)

شاہ حاتم نے زبان کی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا، اور بہت سے بھونڈے اور نامانوس الفاظ نکال کر اس میں وہ شکل و شباہت پیدا کی جو معمولی تبدیلیوں کے

بعد آج تک چلی آ رہی ہے ۔

شاہ حاتم کا مکمل دیوان نایاب ہے ۔ ایک مختصر دیوان مرتب کیا تھا جس کا نام "دیوان زادہ" رکھا تھا ۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے ۔ انتخاب کلام حسرت موہانی نے شائع کیا تھا

ہم سیہ بختوں سے اتنا کیلہ ہے ناحق پیچ و تاب
نام لیں ہم زلف کا سُن سُن کے بل کھاتے ہیں آپ
بے تکلّف دل میں تم آ کر بسو، جی کھول کر
آپ کا گھر ہے یہاں اب کس سے شرماتے ہیں آپ

جی ترستا ہے یار کی خاطر — اُس سے بوس و کنار کی خاطر
تیرے آنے سے یوں خوشی ہے دل — جیسے بلبل بہار کی خاطر
ہمسے مستوں کو بس ہے تیری نگاہ — صبح اُٹھ کر خمار کی خاطر

عمر گذری، کہ ہے کھلی حاتم　　چشمِ دل، انتظار کی خاطر

جب سے تری ادائیں عالم کو بھائیاں ہیں
تب سے جہاں میں تو نے دھومیں مچائیاں ہیں
ٹک اک سرک سرک کر آ بیٹھنا بغل میں
کیا اچپلائیاں ہیں اور کیا ڈھٹائیاں ہیں
زلفوں کا بل بناتے آنکھیں چرا کے چلنا
کیا کم نگاہیاں ہیں کیا کج ادائیاں ہیں
آئینہ روبرو رکھ اور اپنی سج بنانا
کیا خود پسندیاں ہیں کیا خود نمائیاں ہیں

نہ بلبل میں نہ پروانہ میں دیکھا　　جو سودا اپنے دیوانہ میں دیکھا
برابر تیری زلفوں کے سیہ بخت　　میں اپنے بخت کو شانہ میں دیکھا
کسی ہندو مسلماں نے خدا کو　　نہ کعبہ میں نہ بُت خانہ میں دیکھا

نہ کوہستاں میں دیکھا کوہکن نے　　نہ کچھ مجنوں نے ویرانہ میں دیکھا
نہ اسکندر نے دیکھا آئینہ میں　　نہ جم نے اپنے پیمانہ میں دیکھا

فقیروں سے سُنا ہے ہم نے حاتم
مزا جینے کا مر جانے میں دیکھا

دیکھا کسو نے ہم سے زمانے نے کیا کیا　　اور کیا کہیں کہ یار یگانے نے کیا کیا
حاتم دیا ہے شیخ نے اب دل صنم کے ہاتھ　　دیوانہ میں تو تھا، یہ سیانے نے کیا کیا

ہماری سیر کو گلشن سے کوئے یار بہتر تھا　　نفیر بُلبلاں سے نالہائے زار بہتر تھا
کبھو بیمار سُن کر وُہ عیادت کو تو آتا تھا　　ہمیں اپنے بھلے ہونے سے وُہ آزار بہتر تھا
ہماری عقل میں گھر کی گرفتاری سی حاتم کو　　کہو دیوانہ پھرنا کوچہ و بازار بہتر تھا

لہ　صحتیں لاکھوں مری بیماری غم پر نثار　　جس میں اُٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے (حسرت)

مستوں میں جو شیخ آ پھنسا تھا میخانہ میں طرفہ ماجرا تھا
مدّت سے خبر نہیں کچھ اُس کی اک دل بھی ہمارا آشنا تھا

کبھو جو گھر سے وُہ حشمت پناہ نکلے ہے تو جیسے عید کے دن بادشاہ نکلے ہے
زبانِ خلق سے حاتم عجب تماشا ہے جدھر وُہ نکلے ادھر واہ واہ نکلے ہے

ابر میں یادِ یار آوے ہے گریہ بے اختیار آوے ہے
باغ سے گلعذار آوے ہے بُوئے گل پر سوار آوے ہے
اے خزاں، بھاگ جا چمن سی شتاب ورنہ فوجِ بہار آوے ہے
اے صبا، کس طرف کو گذری تھی تجھ سے بوئے نگار آوے ہے

اے خردمندو مبارک ہو تمہیں فرزانگی ہم ہوں اور صحرا ہو، اور حیرت ہو، اور دیوانگی

کون چھوڑے بے سند جبتک نہ دیکھیں مُہرِ داغ　　شمع رو کے پاس پروانے کو بے پروانگی

بے مروت، بے وفا، بے دید، اے نا آشنا　　آشناؤں سے نہ کر بے رحمی و بیگانگی

ملکِ دل آباد کیوں حاتم کا کرتا ہے خراب

اے مری بستی، خوش آتی ہے تجھے ویرانگی

اس دُکھ میں ہائے یار یگانے کدھر گئے　　سب چھوڑ ہم کو غم میں نجانے کدھر گئے

جو اس پری کو شیشۂ دل میں اتارتے　　وے علم عاشقی کے سیانے کدھر گئے

معلوم ہے کسو کو کہ وہ آج شعلہ خو　　مجکو لگا کے آگ لگانے کدھر گئے

ڈھونڈا بہت پر ہم نے نہ پایا انہوں کا کھوج　　دل کو چُرا کے ہم سے چھپانے کدھر گئے

حاتم کے دل کو مصرعۂ اوّل نے خوں کیا

اس دُکھ میں ہائے یار یگانے کدھر گئے

ایذا دہندہ شوخ ستمگار رہ گئے
دلدار اُٹھ گئے، و دِل آزار رہ گئے

نہ دل میں چین ہے میرے، نہ خواب آنکھوں میں
پھرے ہے جب سے وُہ خانہ خراب آنکھوں میں

★

سودا

(۱۷۱۳ء تا ۱۷۸۱ء)

مرزا محمد رفیع۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں گردش زمانہ کی وجہ سے وطن چھوڑا۔ پہلے فرخ آباد گئے پھر فیض آباد۔ شجاع الدولہ بادشاہ اودھ کے دربار کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہوئے۔ اور وہیں انتقال کیا۔ سودا شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ کچھ اُستاد کے فیض سے لیکن بہت کچھ اپنی ذہانت اور قابلیت سے شعر و شاعری کے سب مدارج طے کئے۔ ان کی غزلیں لاجواب ہیں عشق و عاشقی تصوف و اخلاق سب مضامین موجود ہیں۔ زبان میں روانی اور طرز ادا میں شگفتگی ہے۔ قصائد فارسی کے اعلیٰ شعرا سے کم نہیں۔ مثنویاں، ہجویں، قطعات، پہیلیاں

سب کچھ لکھ گئے ہیں۔ اردو میں مسدس کی شکل میں مرثیہ شاید پہلی بار سوداؔ نے لکھا۔ ایک مختصر دیوان فارسی بھی چھوڑا ہے۔ غزلوں کا انتخاب یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے ان کے کلام کے لطف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ طبیعت کی شوخی اکثر کلام میں نظر آجاتی ہے۔

میر تقی میرؔ سوداؔ کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"سر آمد شعرائے ہندی اوست، بسیار خوش گو است۔ بلاگردان ہر شعرش صرف لطف رستہ رستہ، در چمن بندی الفاظش گلِ معنی دستہ دستہ، ہر مصرع برجستہ اش را سرو آزاد بندہ، پیش فکرِ عالیش طبع عالی شرمندہ ...."

ہ

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں

اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں

وُہ رہا دستِ تاسف کے تئیں ملتا ہوا
جن نے وُہ انکھیاں خمار آلودہ رلیاں دیکھیاں

ہائے جس دن سے گیا ہو کر خفا وُہ تُند خو
غنچۂ دل کی کھلی پھر ہیں نہ کلیاں دیکھیاں

کس کے گھر میں چھپ گیا اے شوخ تو کیا جانئے
ہم نے سارے شہر کی دن رات گلیاں دیکھیاں

آہ، اپنی میں ثمر ڈھونڈے ہے اے سودا تو کیا
بیدِ مجنوں کی نہ شاخیں ہم نے پھلیاں دیکھیاں

کیا مچائی اُن نے میرے دل کے کاشانے میں دھوم
شور ہے جس کے لئے کعبہ میں بُتخانے میں دھوم
مٹ گئے وہ شور دل کے ہائے تب آئی بہار

ورنہ کیا کیا ہم بھی کرتے شہر و ویرانے میں دُھوم
تجھ نگاہِ گرم کی حسرت سے دل مارے ہے جوش
رات کو دیکھوں ہوں میں جب شمع و پروانے میں دُھوم
کب سے اے سوداؔ شراب اس بزم میں پیتے ہیں یار
تو نے اے کم ظرف، کی پہلے ہی پیمانے میں دُھوم

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے
سو اک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں
یہ رنجش میں ہم کو ہے بے اختیاری
تجھے تیری کھا کر قسم دیکھتے ہیں
غرض کفر سے کچھ، نہ دیں سے ہے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
حبابِ لبِ جو ہیں اے باغباں ہم
چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں
مٹا جائے ہے حرف حرف آنسوؤں سے
جو نامہ اُسے کر رقم دیکھتے ہیں

اکڑ سے نہیں کام سُنبل کی ہم کو — کسی زُلف کا پیچ و خم دیکھتے ہیں
خدا دشمنوں کو نہ وُہ کچھ دکھا دے — جو کچھ دوست اپنے سی ہم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا
اسے تیرے کوچہ میں کم دیکھتے ہیں

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں — اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں
آیا تھا کیوں عدم سے کیا کر چلا جہاں میں — یہ مرگ و زیست تجھ بن آپس میں ہنستیاں ہیں
کیونکر نہ ہو مشبک شیشہ سا دل ہمارا — اُس شوخ کی نگاہیں پتھر میں دھنستیاں ہیں
برسات کا تو موسم کب کا نکل گیا، پر — مژگاں کی یہ گھٹائیں اب تک برستیاں ہیں
لیتے ہیں چھین کر دل عاشق کا پل میں دیکھو — خوباں کی عاشقوں پر کیا پیش دستیاں ہیں
قیمت میں ان کے گو ہم دو جگ کو دے چکے اب — اس یار کی نگاہیں تس پر بھی سستیاں ہیں
جب میں کہا یہ اس سے سودا سے اپنے مل کے — ق — اس سال تو ہے ساقی اور مے پرستیاں ہیں

اُن نے کہا یہ مجھ سے اب چھوڑو دخترِ رَز کو
پیری میں اے دِوانے یہ کون مستیاں ہیں

آنکھوں کو ٹک سنبھالو یہ مارتی ہیں راہیں
نبھنے مسافروں کو دیتی نہیں نگاہیں
آوے جو سیر کرنے اک بار وُہ چمن میں
گل آسماں پہ پھینکیں اپنی سدا کلاہیں
اس دل میں گو ہماری الفت نہیں رہی اب
اپنی طرف سے اے دل ہم تو بھلا نباہیں
ٹک مہر دے خدایا کافر بتوں کے دل میں
یا عاشقوں کے جی سے کھو دے انہوں کی چاہیں
سوداؔ تو عاشقی میں ثابت قدم یہ رہنا
فرقہ میں عاشقوں کے تا سب تجھے سراہیں

آ پہونچ ساقی، کہ پھر ایام کب آتے ہیں یہ
فصل گل کے کچھ گئے دن، کچھ چلے جاتے ہیں یہ

اس قدر بانکے ہیں اے ظالم تری پگڑی کے پیچ
دل مرا اٹکا ہے زلفوں بیچ، بل کھاتے ہیں یہ

کیونکہ غمازوں سے سمجھوں آہ یوں کہدیں گے پھر
مُنہ لگاتے تم نہیں، غیروں پہ جھنجھلاتے ہیں یہ

دل تو ہے آفت طلب، پر کو رہو جاویں یہ چشم
جو بلا ملتی ہے ان سے اس کو دکھلاتے ہیں یہ

غیرتِ عشق آ کے اے سوداؔ تو پروانوں سے سیکھ
شمع سے اپنا بھی ملنا دیکھ جل جاتے ہیں یہ

بولو نہ بول شیخ جی ہم سے کڑے کڑے
یاں چٹ کئے ہیں اس سے عمامے بڑے بڑے

قامت نے تیرے باغ میں جا خطِّ بندگی
لکھوا لیا ہے سروِ چمن سے کھڑے کھڑے

لگ جا گلے سے اب تو مرے یار کیا ہوا
دو روز دوستی میں جو باہم لڑے، لڑے

کیا قدرِ دل بُتاں کو جنہوں کی گلی کے بیچ　　دل خاک ہو گئے ہیں کروڑوں پڑے پڑے
دنداں دہن میں وقتِ تبسم نہ دیکھے ہم　　موتی سے کچھ ہمیں نظر آئے جڑے جڑے
سوداؔ کے ہوتے وامق و مجنوں کا ذکر کیا
عالم عبث اکھاڑے ہے مُردے گڑے گڑے

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی　　اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانئے ورنہ　　کافی ہے تسلی کو تری ایک نظر بھی
کس ہستیِ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار　　کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھکو خبر بھی
تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش　　رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی
سوداؔ تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو، ٹک تو کہیں مر بھی

نسیم ہے ترے کوچہ میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

جلے ہے شمع سے پروانہ اور میں تجھ سے
کہیں ہے مہر بھی جگ میں کہیں وفا بھی ہے

زبانِ شکوہ سو اب زمانہ میں ہیہات
کوئی کسی سے بہ ہمدگر آشنا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیّاد
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

جوں غنچہ تو چمن میں بندِ قبا کو کھولے
پھر گُل سے اے پیارے بُلبل کبھو نہ بولے

آوے گا وُہ چمن میں تڑکے ہی میکشی کو
شبنم سے کہدے بلبل پیالے گلوں کے دھولے

باغِ جہاں میں آکر کچھ ہم نے پھل نہ پایا
اِک دِل ملا کہ جس میں ہیں سیکڑوں پھپھولے

ایسا ہی جاؤں جاؤں کرتے ہو تو سدھارو
اس دل پہ کل جو ہونی سو آج ہی وُہ ہولے

کم بولنا ادا ہے ہر چند پر نہ اِتنا
مند جائیں چشم عاشق تو بھی وُہ لب نہ کھولے

چشم پر آب ہوں میں جوں آئینہ حبابی
اک اک کے پڑگئے ہیں چھاتی میں سب پھپھولے

کون ایسا اب کہے ہے سودا گلی میں اُس کی
آ تجھکو لے چلیں ہم دل کھول کر تو رولے

اُمیدِ وصل جز طمعِ خام کچھ نہیں
ہر صبح ہے قسم پہ قسم شام کچھ نہیں

وضعِ بہار دیکھ کے مانندِ آبشار
جز گریہ اس چمن میں ہمیں کام کچھ نہیں

اُس شوخ بے وفا و فراموش کار سے
مدت ہوئی کہ نامہ و پیغام کچھ نہیں

سمجھاؤں اپنے کفر کے گر رمز شیخ کو ـــــ بے اختیار کہہ اُٹھے اسلام کچھ نہیں
طاقت نہیں ہے اتنی کہ بے طاقتی کروں ـــــ موجب مرے سکوت کا آرام کچھ نہیں
دیکھا نہ حال سودا کا کوچہ میں عشق کے
اے دِل، تو عاشقی کا نہ لے نام، کچھ نہیں

کیفیّتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا ـــــ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے ـــــ یہ وُہ نین ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے

کہیں مہتاب نے دیکھا ہی تجھ خورشید تاباں کو ـــــ پھرے ہے ڈھونڈھتا ہر شب جہان آباد کی گلیاں
دِوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

مظہر

(۱۶۹۸ء ؁ ۱۷۸۱ء)

مرزا مظہر جانِ جاں۔ خاندانِ تیموریہ سے تھے۔ عالم و فاضل، شاعر اور صوفی تھے۔ کلام میں تصوّف کا رنگ غالب ہے۔ اپنے زمانہ کے عام رنگ سے علیحدہ تھے۔ ایہام کے طرز کو ترک کر کے فارسی بندشوں اور بلند مضامین کو داخل کرنے میں ان کا خاص حصّہ تھا۔

میر تقی میرؔ نکات الشعرا میں لکھتے ہیں:-

"مرد بیت مقدّس، مظہرؔ، درویش، عالم صاحبِ کمال شہرۂ عالم، بے نظیر، معزّز، مکرّم، پدر اورا مرزا جان نام داشت،

از فرطِ شفقت مرزا جانِ جاں میگفت۔ ازیں سبب ہمیں اسم موسوم است۔ اکثر اوقات در یادِ الٰہی صرف میکند۔ خوش تقریر بمرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد۔ دیوان مختصر شعر فارسی او بہ نظر فقیر مؤلف آمدہ است۔ از سلیم و کلیم پائے کمی ندارد۔ اگرچہ شعر گفتن دون مرتبہ اوست لیکن گاہے متوجہ ایں فن بے حاصل نیز میشود۔۔۔۔۔۔"

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گُل اپنا، باغباں اپنا

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بدگماں اپنا

مرا جی جلتا ہے اُس بُلبلِ بیکس کی غربت پر
کہ جن نے آسرے پر گُل کے چھوڑا آشیاں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانِ جاں اپنا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہی بہار
ہائے بس چلتا نہیں، کیا مفت جاتی ہی بہار

لالہ و گُل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہی بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے   کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے
خدا کے واسطے اسکو نہ ٹوکو   یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

جواں مارا گیا خوبوں کے اوپر میرزا مظہر
بھلا تھا یا بُرا تھا، زور کچھ تھا، خوب کام آیا

فغاں

(۔۔۔۔۔۔ : ۱۷۷۲ء)

اشرف علی خاں۔ احمد شاہ کے رضاعی بھائی اور دربار کے اراکین میں سے تھے۔ بقول میر تقی میر، قزلباش خاں اُمید کے شاگرد تھے۔ لیکن دوسرے تذکرہ نویس ندیم کا شاگرد بتاتے ہیں۔ اپنی بذلہ سنجی کی بنا پر ظریف الملک کوکہ خان بہادر کا خطاب پایا۔ دہلی کی تباہی پر کچھ دنوں کے لئے مرشد آباد اور عظیم آباد چلے گئے تھے۔ لیکن بالآخر وطن واپس آگئے۔ فغاں بھی دورِ اوّل کے اُن شعرا میں سے تھے جنہوں نے زبان کی اصلاح کی کوشش کی اور اردو غزل کو فارسی سے ہم پلّہ بنانے میں نمایاں حصّہ لیا۔

آنکھوں نے یے سفینۂ اُلفت ڈبو دیا　　کچھ بس نہ چل سکا تو مری جان رو دیا

باتیں تری کسی کے بھی دل کو بھلی لگیں　　میرا جگر نہ ہووے کہ پیکان چبھو دیا

سن لی خبر کہاں سے مرے اشکِ چشم کی　　کس نے یہ تیرے کان میں موتی پرو دیا

خون آنکھوں سے نکلتا ہی رہا　　کاروانِ اشک چلتا ہی رہا

اس کفِ پا پر ترے رنگِ حنا　　جن نے دیکھا، ہاتھ ملتا ہی رہا

صبح ہوتے بجھ گئے سارے چراغ　　داغِ دل تا شام جلتا ہی رہا

کب ہوا بیکار یہ پتلا خاک کا　　یہ تو سو قالب میں ڈھلتا ہی رہا

یہ ہوئے کب داغ میرے جسم کے　　یہ شجر ہر وقت پھلتا ہی رہا

کب تھما آنکھوں سے میرے خونِ دل　　جوش کھا کھا کر اُبلتا ہی رہا

کیا ہوا مرہم لگانے سے فغاں

زخم دل سینہ میں سلتا ہی رہا

ہرگز مرا وحشی نہ ہُوا رام کسی کا
وُہ صبح کو ہے یار مرا، شام کسی کا

اس ہستیٔ موہوم میں ہرگز نہ کھلی چشم
معلوم کسی کو نہیں انجام کسی کا

اتنا کوئی کہہ دے کہ مِرا یار کہاں ہے
باللہ میں لینے کا نہیں نام کسی کا

ہونے دے مرا چاک گریباں مرے ناصح
نکلے مرے ہاتھوں سے بھلا کام کسی کا

ناحق کو فغاں کے تئیں تشہیر کیا ہے
دُنیا میں نہ ہووے کوئی بدنام کسی کا

اے زمیں تا بہ آسماں دیکھا
ہم نے تجھکو کہاں کہاں دیکھا

نہ تھما کاروانِ اشک کبھی
نت یہی قافلہ رواں دیکھا

ایک دم کب ملی ہے فرصتِ دید
آنکھ بھر کر تجھے کہاں دیکھا

جب تلک ہم رہے چمن میں فغاں
ق
تب تلک جورِ باغباں دیکھا

آ گئے دام میں تو واں شب و روز
روئے صیاد مہرباں دیکھا

اب جو آئے قفس سے چھوٹ کے ہم گُل کہاں، موسمِ خزاں دیکھا

کچھ نہ دیکھا چمن میں پھر آ کر

ایک اُجڑا سا آشیاں دیکھا

مے نہیں، مینا نہیں، ساغر نہیں، ساقی نہیں

جی میں آتا ہے لگا دوں آگ میخانہ کے تئیں

تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں ق انصاف کو نہ چھوڑ مروّت اگر گئی

آخر فغاں وہی ہے اُسے کیوں بھلا دیا وُہ کیا ہوئی تپاک، وُہ اُلفت کدھر گئی

مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے

یوں بھی گذر گئی، مری دوں بھی گذر گئی

محرابِ کعبہ پاوے ایسے کہاں نمازی
ابرو کی یہ بلندی، مژگاں کی یہ درازی

ہیٹے کبھی نہ ہوویں یہ کشتۂ محبّت
گر مر گئے شہادت، جیتے رہے تو غازی

ناحق ہوئے مخالف بیگانہ و یگانہ
بے چارہ دل کرے اب کس کس کی چارسازی

ان عاشقوں کے جی کو آخر نیاز لے گی
اے میرے ناز پرور یہ تیری بے نیازی

جینے گا کیا فغاں تو دل کو لگا کے دیکھا
جی ہار دے گی آخر تیری یہ عشق بازی

تاباںؔ

میر عبدالحئ۔ افسوس ہے کہ ان کے مفصّل حالات دستیاب نہ ہوئے لیکن تذکروں سے یہ ثابت ہے کہ عجیب رنگین شخصیت رکھتے تھے۔ دہلی کے اکثر صاحب کمال ان کو نہایت عزیز رکھتے تھے۔ اپنی بد اعتدالیوں، خصوصاً کثرتِ شراب نوشی کے ہاتھوں جوانی ہی میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ میر تقی میرؔ نکات الشعرائیں ان کو اس طرح یاد کرتے ہیں:۔

"نوجوان با مزہ بود۔ سیّد نجیب الطرفین، مولداو شاہجہاں آباد است، بسیار خوش فکر و خوبصورت، خوش خلق، پاکیزہ سیرت معشوق عاشق مزاج، تاحال در فرقۂ شعرا ہمچو او شاعر خوش ظاہر از ممکن

بطون عدم بعرصۂ ظہور جلوہ گر نشدہ بود۔ زبان نگینش پاکیزہ تراز برگِ گل۔ گلستانِ سخن را نازک دماغ بلبل۔ سمند رنگینی۔ فکرش با گلگونِ بادِ بہار طابق النعل بالنعل است۔ ہر چند عرصۂ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام است۔ امّا بسیار رنگیں می گفت ...... آخر آخر کہ اوائل جوانی او بود ایں قدر مداومت مست شراب کردہ کہ ملاقات ہمہ یاراں موقوف شد۔

حاصل آفتاب تاباں عمر او زود بلب بام رسیدہ۔ معشوق عجیبے از دستِ روزگار رفت افسوس افسوس۔ امید قوبیت کہ حق تعالےٰ مغفرتش کردہ باشد......"

سُن فصلِ گل، خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں	کیا بلبلوں نے دیکھو، دھومیں مچائیاں ہیں
بیمار ہے زمیں سے اُٹھتی نہیں عصا بن	نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں
خورشید گر کہوں ہیں تو جان وُہ ہے پیلا	جو مہ کہوں ترا رو، اس پر تو جھائیاں ہیں

جب پان کھا کے پیارا گلشن میں جا ہنسا ہے
بے اختیار کلیاں تب کھل کھلائیاں ہیں

کہتے تھے ہم کسی سے تم بن نہیں ملیں گے
اب کس کے ساتھ پیارے وے دلربائیاں ہیں

عاشق سے گرم ملنا پھر بات بھی نہ کہنا
کیا بے مروتی ہے کیا بے وفائیاں ہیں

افسوس اے صنم تم ایسے ہوئے ہو ابتر
ملتے تو غیر سے جا ہم سے رو کھائیاں ہیں

اب مہرباں ہوا ہے تاباں ترا ستمگر
آہیں تری کسی نے شاید سنائیاں ہیں

کہتے ہیں اثر ہو گا رونے میں یہ ہیں باتیں
اک دن بھی نہ یار آیا، روتے ہی کٹی راتیں

سودا میں گذرتی ہے کیا خوب طرح تاباں
دو چار گھڑی رونا، دو چار گھڑی باتیں

ترے پاس عاشق کی عزّت کہاں ہے
تجھے بے مروّت، مروّت کہاں ہے

بیاں کیا کروں ناتوانی میں اپنی
مجھے بات کہنے کی طاقت کہاں ہے

تمنا تری ٹھوکروں کی ہے لیکن رکھوں پاؤں پر سر یہ جرأت کہاں ہے

جو اس کی کمر ہیں نے دیکھی ہے تاباںؔ
رگِ گل میں ایسی نزاکت کہاں ہے

عشق کیا شے ہے، کسی کامل سے پوچھا چاہئے
کس طرح جاتا ہے دل، بیدل سے پوچھا چاہئے
کیا تڑپنے میں مزا ہے قتل ہو پیارے کے ہاتھ
اس کی لذت کو کسی لبسمل سے پوچھا چاہئے
جس نے اس کا زخم کھایا ہو اُسے معلوم ہو
تیغِ ابرو کی صفت گھائل سے پوچھا چاہئے
یار کے ملنے کی کوئی طرح آتی ہی نہیں
طرح ملنے کی کسی واصل سے پوچھا چاہئے

آہ و نالہ کی حقیقت پوچھتا ہوں ہجر میں
کیا گذرتی ہوگی تاباںؔ، دل سے پوچھا چاہیئے

بال اپنے کھولتا ہے جب تو اے خورشید رو
چاند سے منہ پہ ترے اس وقت آجاتا ہے ابر

ایمان و دیں سے تاباںؔ کچھ کام نئیں ہے ہم کو
ساقی ہو اور مے ہو، دُنیا ہو اور ہم ہوں

دیکھنا اِن ماہرویوں کا تو اے تاباںؔ نہ چھوڑ
چاہتا ہے گر ہمیشہ نور بینائی کے تئیں

جُوں برگِ گُل سے باغ میں شبنم ڈھلک پڑے
کیا ہو کہ برگِ تاک سے یوں مے ٹپک پڑے
محفل کے بیچ سُن کے مرے سوزِ دل کا حال
بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

ؕ

دردؔ

(۱۷۲۰ء تا ۱۷۸۴ء)

دہلی میں پیدا ہوئے۔ صاحبِ علم اور صاحبِ باطن تھے۔ فلسفہ، اخلاق اور تصوف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ کلام میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے۔ زبان کی سادگی اِن کی قابلیت کا ثبوت ہے۔ مختصر دیوان چھوڑا ہے۔ لیکن مضامین اور اندازِ بیان کی پاکیزگی اور اس کے ساتھ لطافتِ کلام کے لئے لاجواب ہے۔ انتالیس[۳۹] برس کے سن میں دنیا چھوڑکر اپنے والد ماجد کی جگہ سجادہ نشین ہو گئے تھے۔ کئی تصنیفات فلسفۂ تصوّف پر موجود ہیں۔ شاگردوں میں قائمؔ چاندپوری سب سے مشہور رہیں۔ میر تقی میرؔ لکھتے ہیں:۔

"المتخلّص بہ دردؔ۔ جوشِ بہارِ گلستانِ سخن۔ عندلیبِ خوش خوانِ

چمن ایں فن، زبان گفتگوئش گرہ کشائے زلفِ شامِ مدعا۔ مصرعِ نوشتہ

اش بر صفحۂ کاغذ از کاکلِ صبح خوشنما۔ شاعرِ زور آور ریختہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مدرسہ یا دیر تھا، یا کعبہ یا بُت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں توہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

حیف کہتے ہیں ہُوا گلزار تاراجِ خزاں
آشنا اپنا بھی واں اِک سبزۂ بیگانہ تھا

ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ
وُہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا خوش رہ عبث وے سابقے مت یاد کر

درؔد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

کبھو خوش بھی کیا ہے دل کسی رندِ شرابی کا

بھڑا دے مُنہ سے مُنہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

چُھپے ہرگز نہ مثلِ بُو وُہ پردوں کے چُھپانے سے
مزا پڑتا ہے جس گُل پیرہن کو بے حجابی کا

شرارِ برق کی سی بھی نہیں یاں فرصتِ ہستی
فلک نے ہم کو سونپا کام جو کچھ تھا شتابی کا

میں اپنا دردِ دل چاہا کہوں جس پاس عالم میں
بیاں کرنے لگا قِصّہ وُہ اپنی ہی خرابی کا

زمانے کی نہ دیکھی جُرعہ ریزی دردؔ کچھ تو نے
ملایا مثلِ مینا خاک میں خوں ہر شرابی کا

جان پہ کھیلا ہوں میں، میرا جگر دیکھنا — جی نہ رہے یاد ہے، مجھکو ادھر دیکھنا
گرچہ وُہ خورشید رو نت ہے مرے سامنے — تو بھی میسر نہیں، بھر کے نظر دیکھنا
سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک — اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

لہ ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے (غالب)

ذکرِ وفا کیجئے اس سے جو واقف نہ ہو   کہتے ہو کس سے یہ تم ٹک تو ادھر دیکھنا

نالۂ دل کا اثر، دیکھ لیا دردؔ، بس
جی ہیں نہ رہ جائے یہ، آہ بھی کر دیکھنا

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا   تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا
میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے   مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا
گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں   میں پہونچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا
جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے   تو کہہ کب تلک آزماتا رہے گا
قفس میں کوئی تم سے اے ہمصفیرو   خبر گل کی ہم کو سناتا رہے گا

خفا ہو کے اے دردؔ مرتو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

اُن نے قصداً بھی میرے نالے کو
نہ سُنا ہوگا، گر سُنا ہوگا

دیکھئے غم سے اب کے جی میرا
نہ بچے گا بچے گا کیا ہوگا

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

حال مجھ غمزدہ کا جس تس نے
جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا

دل کے پھر زخم تازے ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

یک بیک نام لے اُٹھا میرا
جی میں کیا اس کے آگیا ہوگا

میرے نالوں پہ کوئی دُنیا میں
بِن کیے آہ کم رہا ہوگا

لیکن اس کو اثر خدا جانے
نہ ہوا ہوگا یا ہوا ہوگا

قتل سے میرے وُہ جو باز رہا
کسی بدخواہ نے کہا ہوگا

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

بے زباں ہے بہ وہ زباں سوسن اس چمن میں کسے مجالِ سخن

یاوری دیکھئے نصیبوں کی دوست بھی ہو گئے مرے دشمن

ساقی اس وقت کو غنیمت جان پھر نہ میں ہوں، نہ تو، نہ یہ گلشن

وُہ زِ خود رفتہ ہوں، کہ میرے تئیں نہ خیالِ سفر نہ یادِ وطن

کیا کہوں اپنی میں سیہ بختی حال دل تجھ پہ ہو ویگا روشن

بعد مدت کے درد کل مجھ سے ق مل گیا راہ میں وُہ غنچہ دہن

میری اُس کی جو لڑ گئیں آنکھیں

ہو گئے آنکھوں ہی میں دو دو بچن

دل کو لے جاتی ہیں معشوقوں کی خوش اسلوبیاں

ورنہ ہیں معلوم ہم کو سب انہوں کی خوبیاں

صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو حورِ بہشت

پر کہاں یہ شوخیاں یہ طور یہ محبوبیاں

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیان

آپ تو تجھیں ہی پر اُس کا بھی کیا خانہ خراب
دردؔ اپنے ساتھ آنکھیں دل کو بھی لے ڈوبیاں

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وُہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یارب یہ کیا طلسم ہے، ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی یہ کیا حصول
دل سے اُٹھا غلاف اگر تو اُٹھا سکے

اطفائے نارِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے — یہ آگ وُہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مستِ شرابِ عشق وُہ بیخود ہے جسکو حشر
اے دردؔ چاہے لائے بخود پر نہ لا سکے

آتشِ عشق جی جلاتی ہے — یہ بلا جان ہی پہ آتی ہے
تو ہے اور سیرِ باغ ہے ہر وقت — داغ ہیں اور میری چھاتی ہے
شام بھی ہو چکی کہیں اب تو — آشتابی کہ رات جاتی ہے
کچھ مناسب نہیں ہی کیا کہئے — جی میں جو کچھ کہ اپنے آتی ہے
ٹک خبر لے کہ ہر گھڑی ہم کو — اب جدائی بہت ستاتی ہے

دردؔ اس کی بھی دید کر لیجئے
نوجوانی یہ مفت جاتی ہے

آرام سے کبھو بھی نہ یک بار سو گئے
ایسے ہمارے طالعِ بیدار سو گئے

خوابِ عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے
آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے

اُٹھتی نہیں ہے خانۂ زنجیر سے صدا
دیکھو تو کیا سبھی یہ گرفتار سو گئے

تیری گلی ہے یا کوئی آرام گاہ ہے
رکھتے قدم کے پاؤں تو ہر بار سو گئے

وُہ مر چکے جو رونقِ بزمِ جہان تھے
اب اُٹھئے دَر دیاں سے کہ سب یار سو گئے

تہمتِ چند اپنے ذمّے دھر چلے
کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے، اے صبا
ایک دم آئے اِدھر، اُودھر چلے

دوستو، دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو، اب ہم تو اپنے گھر چلے

آہ بس جی مت جلا تب جانئے
جب کوئی افسوں ترا اس پر چلے

شمع کی مانند ہم اس بزم میں — چشم نم آئے تھے، دامن تر چلے

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے — شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

جوں شرر اے ہستیٔ بے بُود یاں — بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہی چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے — یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کی کیا چلے

کس کی یہ موجِ حسن ہوئی جلوہ گر کہ یوں — دریا میں جو حباب تھے آنکھیں چھپا چلے

ہم بھی جرس کی طرح تو اس قافلہ کے ساتھ — نالے جو کچھ بساط میں تھے سو سنا چلے

کہہ بیٹھیو نہ درد، کہ اہل وفا ہوں میں
اُس بیوفا کے آگے جو ذکرِ وفا چلے

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا   پر وُہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

رو بیٹھے گا میری ہی طرح دین کو اپنے   کافر، جو ترے ساتھ مسلمان ملے گا

سیر کر دنیا کی غافل، زندگانی پھر کہاں
زندگی گر کچھ رہی، تو نوجوانی پھر کہاں

کرے ہے مست نگاہوں میں ایک عالم کو
لئے پھرے ہے یہ ساقی شراب آنکھوں میں

⁂

قائمؔ

(۱۷۳۰ء ؁ ۱۷۹۴ء)

شیخ محمد قائمؔ، چاندپور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ زیادہ وقت دہلی میں گذرا۔ پہلے میر دردؔ اور پھر سوداؔ کے شاگرد ہوئے۔ آخر عمر میں رام پور گئے اور وہیں انتقال کیا۔ قائمؔ کی غزلوں میں اعلیٰ جذبات، بندشوں کی خوبی اور مضامین کی رنگا رنگی نظر آتی ہے۔

پھر کے وہ شوخ نظر کر گیا　　تیر سا اک دل سے گذر کر گیا

خاک کا اک ڈھیر سر رہ ہوں میں　　قافلۂ عمر سفر کر گیا[۱]

---

[۱] میں پس ماندۂ قافلہ دل جلا ہوں　　کہے تو کہ یہ آتشِ کارواں ہے (میرؔ)

خلدِ بریں اسکی ہے واں بود و باش — یاں کسی دل بیچ جو گھر کر گیا

پوچھ نہ قائمؔ کہ کٹی کیونکہ عمر — جوں ہوا، یک چند بسر کر گیا

میں خوب اہل جہاں دیکھے اور جہاں دیکھا — پر آشنا کوئی دیکھا نہ مہرباں دیکھا

ہمیشہ منع تو کرتا تھا باغ سے ہم کو — سو حال اب گل و گلشن کا باغباں دیکھا

سُنے کو دیکھے پہ ہم دیویں کس طرح ترجیح — خدا کو ہم نے سُنا ہے تمہیں بتاں دیکھا[1]

نجانے کونسی ساعت چمن سے بچھڑے تھے — کہ آنکھ بھر کے نہ پھر سوئے گلستاں دیکھا

طلب کمال کی کوئی نہ کیجیو زنہار — کہ میں یہ کر کے فضولی بہت زیاں دیکھا

میں وہ اسیرِ قفس ہوں کہ عمر بھر جس نے — نہ سیرِ باغ کی، نے روئے آشیاں دیکھا

برنگِ غنچہ بہار اس چمن کی سُنتے تھے — پہ جوں ہی آنکھ کھلی، موسمِ خزاں دیکھا

لہ ترا دیدہ و یوسف را شنیدہ — شنیدہ کے بود مانند دیدہ (لاعلم)

نہ کہتے تھے تجھے قائمؔ کہ دل کسی کو نہ دے
مزا کچھ اس کا بھلا، تو نے اے میاں دیکھا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا
ہائے چپ بھی رہا نہیں جاتا

روبرو میرے غیر سے تو ملے
یہ ستم تو سہا نہیں جاتا

ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم
کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

گرچہ قائمؔ اسیرِ دام ہوں، لیک
مجھ سے یہ چھپا نہیں جاتا

قائمؔ ترے سخن کو شوخی میں مانتا ہے
ظاہر میں تجھ سے ناخوش گو ہے ہزار سوداؔ

اب کی جو یہاں سے جائیں گے ہم
پھر تجھ کو نہ منہ دکھائیں گے ہم

مشکل ہے نہ آنا تجھ گلی ہیں ق پر یہ بھی سہی، نہ آئیں گے ہم

ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا ٹک دُور سے دیکھ جائیں گے ہم

جینے ہی سے ہاتھ اٹھائینگے لیک باتیں نہ تری اٹھائیں گے ہم

اس پر بھی اگر ملیں گے تو خیر

قائم ہی نہ پھر کہائیں گے ہم

بیداریٔ شب شیخ کی ثابت ہے، ولیکن کیا جانئے کس کام میں بیدار رہے ہے

یہ جانتا ہیں نہیں ہوں کہ دل ہے کیا قایم

پر اک خلش سی رہے ہے مُدام سینے میں

موافقت کی بہت شہریوں سے میں لیکن وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں

بسانِ اشک ہے قائمؔ تو جب سے آوارہ وقار تب سے ترا کم رہا ہے آنکھوں میں

جورِ سپہر، دوریٔ یاراں و روئے غیر جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں

جی میں چہلیں تھیں جو کچھ سو تو گئیں یار کے ساتھ
سر ٹپکنا ہے پڑا اب در و دیوار کے ساتھ

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھوں کے سو چلے
بلبلو خوش رہو اب تم گل و گلزار کے ساتھ

گرچہ[1] بلبل ہوں میں قائمؔ مگر اس باغ کے بیچ
فرق کوئی نہ کرے گل کو یہاں خار کے ساتھ

---

[1] گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں (جگر)

دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے — شمع کا کس پہ دل پگھلتا ہے

ہمنشیں، ذکر یار کر کچھ آج — اس حکایت سے جی بہلتا ہے

دل مژہ تک پہونچ چکا، ای اشک — اب سنبھالے سے کب سنبھلتا ہے

ساقیا، دور کیا کرے ہے تمام — آپ ہی آپ دور چلتا ہے

آج قائم کے شعر ہم نے سنے — ہاں، اک انداز تو نکلتا ہے

جوں طفلِ سرشک ارغوانی — پامال ہوئی مری جوانی

پھرے زمانہ جہاں تک ہے ہم سے، یا نہ پھرے
کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا، خدا نہ پھرے
ہزار حیف، کہ گلچیں ہے اس جگہ گستاخ
میں جس چمن میں یہ چاہوں تھا یاں صبا نہ پھرے

خزاں میں غیر مروّت ہے چھوڑنا گلشن
ہم اور ہوائے چمن، جب تلک ہوا نہ پھرے

دل پا کے اُس کی زلف میں آرام رہگیا
درویش جس جگہ کہ ہوئی شام، رہگیا

جھگڑے میں ہم جہاں کے یہانتک پھنسے کہ آہ
مقصود تھا جو اپنے تئیں کام، رہگیا

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہگیاؔ

خورشید کب اس طرح شفق سے ہو نمایاں
جو چاند سے منہ پر ہے ترے سرخ دوشالا

گرچہ دلکش ہیں سب بتاں کی ادا
لے گئی جی پر اس جواں کی ادا

کرنی عاشق پہ تہمت، اے قائمؔ
یہ بھی ہے ایک مہوشاں کی ادا

ن قسمت کی خوبی دیکھئے، ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

زلف دیکھی تھی کس کی خواب میں، رات
ہم سحر تک تھے پیچ و تاب میں رات

اُس کے مُکھڑے پہ زلف کو ٹک دیکھ
کیونکہ اندھیرے ہے آفتاب میں رات

بے حجابانہ وُہ تو وارد تھا
رہ گئے ہم ہی کچھ حجاب میں رات

ایک جا گہ پہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں
ہے عجب حال مرا، صبح کہیں شام کہیں

اس کمر سے نگہِ شوق لپٹتی تو ہے لیک
جی یہ دھڑکے ہے کہ آ جائے نہ الزام کہیں

تم نے کی دل کی طلب ہم نے کہا دینگے، ولیک
یوں یہ فرمائشیں ہوتی ہیں سرانجام کہیں

پائے دیوار سے پھر میری طرح وُہ نہ اُٹھا
جن نے دیکھا تجھے اکبار سرِ بام کہیں

عزم کعبہ کا تو قائم تو کیا ہے لیکن
رہن مے کیجو نہ واں جامۂ احرام کہیں

گہہ پیرِ شیخ و گاہ مُریدِ مُغاں رہے
اب تک تو آبرو سے نبھی ہے جہاں رہے

صبر و قرار و ہوش و دل و دیں تو واں رہے
اے ہمنشیں، یہ کہہ تو بھلا ہم کہاں رہے

دنیا میں ہم رہے تو کئی دن پر اس طرح
دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے

قسمت تو دیکھ، بار بھی اپنا گرا تو واں
جس دشتِ پر خطر میں کئی کارواں رہے

پیارے، ہمیشہ ایک سی رنجش ہی کچھ بھی لطف
ناخوش کبھی ہوئے تو کبھی مہرباں رہے

مسجد سے گر تو شیخ نکالا ہمیں تو کیا
قائمؔ وہ مے فروش کی اپنی دکاں رہے

عبث ہیں ناصحا ہم سے زخود رفتوں کی تدبیریں
رکے ہے بحر کب گو موج سے ہوں لاکھ زنجیریں

ہماری آہ سے آگے تو پتھر آب ہوتے تھے
یہ کیا جانے وہ اب کیدھر گئیں نالہ کی تاثیریں

لگائی آگ پانی میں یہ کس کے عکس نے پیارے
کہ ہم دیگر چلی ہیں موج سے دریا میں شمشیریں

سنا ہے تیں نہ گوشِ لطف سے احوال کو میرے
چھپی تھیں ورنہ خاموشی میں اپنی لاکھ تقریریں

گریباں کی تو قائم مدّتوں دھجّیں اُڑائی ہیں
پہ خاطر جمع اس دن ہوئے جب سینہ کو ہم چیریں

جو کوئی در پہ ترے بیٹھے ہیں   دونوں عالم سے پھرے بیٹھے ہیں

شاہدِ خوب و مکانِ دلچسپ   ہم یہی حور و ارم جانتے ہیں

⁘

سوز

(۱۷۱۸ء تا ۱۷۹۸ء)

سیّد محمد میر، دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں نکل کر فرخ آباد کا رخ کیا۔ وہاں سے لکھنؤ پہونچے، اور اس کے بعد مُرشد آباد۔ وہاں بھی خوش نہ رہے تو لکھنؤ واپس آئے۔ ابکی بار دربار میں رسائی ہوئی۔ اور نواب آصف الدّولہ ان کے شاگرد ہو گئے۔ باقی عمر لکھنؤ ہی میں گذاری۔

میر سوز کا کلام بناوٹ اور تصنّع سے پاک، سادگی اور زبان کی شیرینی کے لئے مشہور ہے۔ ان کی غزلوں میں بول چال کا لُطف ہے۔

تم بن ہے عذاب زندگانی ہے میری خراب زندگانی
مت کیجو خیال، کل ملیں گے ہے پل میں یہ خواب زندگانی
آجا مرے مہربان، ورنہ جاتی ہے شتاب زندگانی
اتنا نہ چھپو، کہ لے کفن کا گھبرا کے نقاب زندگانی
ایسے جینے سے سوز واللہ
دے کاش جواب زندگانی

شہد میں جیسے مگس، ہم حرص میں پا بند ہیں
وائے غفلت، اس سیہ زنداں میں یوں خرسند ہیں
رزق کا ضامن خدا، شاہد کلام اللہ ہے
تس پہ اپنی صورتوں سے روز حاجتمند ہیں
مقبروں میں دیکھتے ہیں جا کے ان آنکھوں سے روز

یہ برادر، یہ پدر، یہ خویش، یہ فرزند ہیں
رتبۂ رعنائی سے ٹھوکر مار کر چلتے ہیں یار
سوجھتا اتنا نہیں، ہم خاک کے پیوند ہیں
خاکساری، عاجزی، غربت، محبت دوستی
جن کے یہ افعال ہیں وہ ہی سعادت مند ہیں
جب تلک آنکھیں کھلی ہیں، دکھ پہ دکھ دیکھیں گے آہ
مُند گئیں جب انکھڑیاں، تب سوزؔ سب آنند ہیں

کیا کروں دل کو اب قرار نہیں — اس میں کچھ میرا اختیار نہیں
میرے پہلو سے دُور ہو اے دل — تجھ سے صحبت مری برار نہیں
ہر گھڑی وعدہ کر کے بہلانا — ہاں جی ایسا تو میں گنوار نہیں
بیقراری نہ کر خدا سے ڈر — سوزؔ، عاشق کا یہ شعار نہیں

کہیو اے بادِ صبا، بچھڑے ہوئے یاروں کو
راہ ملتی نہیں ہے دشت کے آواروں کو

بال باندھے جنہیں کہتے ہو سو وُہ عاشق ہیں
کیا چھڑاوے کوئی زلفوں کے گرفتاروں کو

جس طرح پایا اُسی طرح لیا دل کو چھین
یہ طرح کس نے سکھائی ہے طرحداروں کو

سوزؔ کا کوئی عمل عفو کے قابل تو نہیں
شاہ بخشائیں مگر ایسے گنہگاروں کو

نہ تھی بے وفائی کی اُمید تجھ سے ق تجھے میں بڑا باوفا جانتا تھا
ولے گرم جوشی سے تھا دل کو خطرہ کہ آخر کرے گا دغا، جانتا تھا
دغا کھائی آخر، دغا کھائی آخر میں کیا جانتا تھا، میں کیا جانتا تھا

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا　　اور کیسی پڑی سر پہ مرے اللہ، نئی[ن]

جن کو نت دیکھتے تھے اب اُن کا　　دیکھنا بھی خیال و خواب ہوا

یار اغیار ہو گئے، ہیہات　　کیا زمانے کا انقلاب ہوا

ن　پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

میرؔ

(۱۷۱۰ء تا ۱۸۱۰ء)

میر محمد تقی۔ اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ لیکن عمر کا زیادہ حصہ دہلی اور لکھنؤ میں گزارا۔ کچھ قسمت کی خرابی اور زمانہ کی پُرآشوبی سے، اور کچھ اپنی نازک مزاجی سے، ہمیشہ پریشان حال رہے۔ ان کا کلام بھی ان ہی حالات کا آئینہ ہے ؎

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبّت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میر تقی میرؔ اردو غزل کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ استادانِ سخن خود اُن کے رتبہ کو تسلیم کرتے ہیں ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اس عقیدت مندی کی خاص وجہ یہ ہے کہ میر کے یہاں سچّے اور حقیقی جذبات مناسب الفاظ میں اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، اور یہ صفات غزل کی شاعری کی جان ہیں عشق و محبت کی باتیں کہتے ہیں تو اپنے خاص انداز میں، کچھ نرمی، کچھ خودداری، اور اکثر و بیشتر ناکامی سے

خوب رُو سب کی جان ہوتے ہیں — آرزوئے جہان ہوتے ہیں

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں — طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں

نیچی آنکھیں ہم اسکو دیکھا کئے — کبھو اونچی نگاہ کرتے تھے

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں، میر، باز آ — نادان، پھر وُہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

وے تو کھڑے کھڑے مرے گھر آکے پھر گئے
میں بے دیار و بے دل و بے خانماں ہوا

میر تقی میر اُن نازک طبع لوگوں میں سے تھے جو دنیا اور دُنیا والوں سے نباہ نہیں کر سکتے۔ ان کی شاعری میں ہر جگہ اس کیفیت کا اثر پایا جاتا ہے ؎

اے جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے
شیوہ یہی سبھوں کا، یہی سب کا طور ہے

میر کے دیوان میں ۲۷ نشتر کہے گئے ہیں۔ لیکن سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جن کو آنکھوں سے لگائیے۔ اکثر پامال مضامین کو بھی اثر خیز بنا دیتے ہیں ؎

ہائے جوانی، کیا کیا کہیے، شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وُہ عہد گیا، وُہ موسم، وُہ ہنگام گیا

جوں سبزہ چل چمن میں، لب جو پہ سیر کر
عمر عزیز جاتی ہے آبِ رواں کی طرح

معشوق سے شکایت سب کو ہوتی ہے۔ لیکن ان کا انداز ملاحظہ ہو ؎

جفائیں دیکھ لیاں بیوفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

میر کو خدائے سخن کہتے ہیں۔ جو مضمون انہوں نے نظم کیا ہے وہ اس سے بہتر کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل ہی سے ملتا ہے۔

غزلوں کے علاوہ میر کی چند مثنویاں بھی مشہور ہیں۔ جن میں "گھر کا حال" "جھوٹ" اور "دنیا" قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت کی فطری مناسبت غزل ہی کے ساتھ تھی اور اسی میں ان کے کلام کے جوہر کھُلتے ہیں۔

تذکرہ نکات الشعراء میں اپنے زمانہ کے بہت سے شاعروں کے مختصر حالات اور کلام کے نمونے پیش کئے ہیں۔ یہ کتاب تاریخی اور ادبی حیثیت رکھتی ہے۔ "ذکرِ میر" میں اپنے حالات لکھے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں انجمن ترقّی اردو نے چھاپی ہیں، اور شکر ہے کہ اب بھی دستیاب ہیں۔

"نکات الشعراء" میں اپنی بابت صرف اتنا لکھا ہے :-

"فقیر حقیر میر محمّد تقی میر مؤلّف ایں نسخہ متوطّن اکبر آباد است۔
بسببِ گردشِ لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد است۔"

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا، اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اسکی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے، ترچھے نیکھے، سب کا تجھ کو امام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کے اُودر گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ، کیسا کلیسا، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں
جُبّہ، خرقہ، کرتا ٹوپی، مستی میں انعام کیا

کاش اب منھ سے برقع اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مُندے پر اُن نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اُس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گل کو مول کیا، قامت سے سرو غلام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا
میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا
ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں
خیال بھی کبھی گذرا نہ پرفشانی کا
نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میرؔ بھی یک بلبلا تھا پانی کا

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا
دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا
گھر جلا سامنے، پر ہم سے بجھایا نہ گیا
دل میں رہ دل میں، کہ معمارِ قضا سے ابتک
ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا

کیا تنگ حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ
ایک دم راز محبّت کا چھپایا نہ گیا

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی، پر اُس کیلئے
ایسا اجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

ابتدائے عشق ہے، روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے، سوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

آنسو مری آنکھوں میں ہر دم جو نہ آجاتا
تو کام مرا اچھا پردے میں چلا جاتا

کہتے تو ہو یوں کہتے، یوں کہتے جو وُہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

جو عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے، بھلا مجکو
جی خود بخود اے ہمدم کلہے کو کھپا جاتا

عشقؔ ہمارے خیال پڑا ہے، خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھیر گیا ہے، صبح گیا یا شام گیا

عشق گیا سو دین گیا، ایمان گیا، اسلام گیا
دل نے ایسا کام کیا کچھ، جس سے میں ناکام گیا

ہائے جوانی کیا کیا کہیے، شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے، وُہ عہد گیا، وُہ موسم، وُہ ہنگام گیا

نہ ملیو چاہنے والوں سے اپنے — نہ جانے تجھ سے یہ کن نے کہا تھا
پریشاں کر گئی فریادِ بلبل — کسو سے دل ہمارا پھر لگا تھا
ملے پرسوں، وہی بیگانگی تھی — ہمارے زعم میں وُہ آشنا تھا

ن — عشق ہمرے ہی خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا

صنم خانے سے اُٹھ کعبے گئے ہم
کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا

شب وُہ جو پئے شراب نکلا جانا یہ کہ آفتاب نکلا
قربان پیالۂ مۓ ناب جس سے کہ ترا حجاب نکلا
مستی میں شراب کی جو دیکھا عالم یہ تمام خواب نکلا
شیخ آتے تو میکدہ میں آیا پر ہو کے بہت خراب نکلا
یک جُرعہ شراب ہی میں واعظ ہر مسخرگی کا باب نکلا
تھا غیرتِ بادہ عکس گل سے
جس جوئے چمن سے آب نکلا

متصل روتے ہی رہیئے تو بجھے آتشِ دل ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

وقت خوش اُن کا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو — در و دیوار کو احوال سُنا جاتے ہیں

ایک بیمارِ جدائی ہوں میں آپ ہی تس پر
پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

خوب رو سب کی جان ہوتے ہیں — آرزوئے جہان ہوتے ہیں
کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن — گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں
کیا رہا ہے مشاعرہ میں اب — لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میرؔ و مرزا رفیعؔ و خواجہ میرؔ
کتنے اِک یہ جوان ہوتے ہیں

یہ جو چشم پُر آب ہیں دونوں — ایک خانہ خراب ہیں دونوں
ہے تکلف نقاب، وے رخسار — کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں

تن کے معمورے میں یہی دل و چشم — گھر تھے دو سو خراب ہیں دونوں

کچھ نہ پوچھو کہ آتشِ غم سے — جگر و دل، کباب ہیں دونوں

ایک سب آگ، ایک سب پانی — دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میرؔ

اب جو دیکھو، سراب ہیں دونوں

صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا — صندل بھری جبیں ہیں ہونٹوں کی لالیاں ہیں

اِن گُل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں — جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں — طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں

لہ اس کا وُہ قدِ بالا اس پردہ رُخِ رنگیں — گویا کہ سرِ شاخے کوئی گُلِ تر دیکھا (جگر)

ایک نے صورت نہ پکڑی ہیچ مار — دل میں شکلیں سیکڑوں ٹھہرائیاں
آچمن میں یہ بھی ہے کوئی روش — ناز تا کے چند بے پروائیاں
شوقِ قامت میں ترے ای نونہال — گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں

پاس مجھکو بھی نہیں ہے اب کے میر
دور تک پہونچیں مری رسوائیاں

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو — ہاں کہو اعتماد ہے ہمکو
شوق ہی شوق ہے نہیں معلوم — اس سے کیا دل نہاد ہے ہمکو
آہ کس ڈھب سے روئیے کم کم — شوق حد سے زیاد ہے ہمکو
شیخ و پیرِ مغاں کی خدمت میں — دل سے اک اعتقاد ہے ہمکو

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہمکو

ہم سے کچھ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں میں نے
عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھ

دل گیا، ہوش گیا، صبر گیا، جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ

نام ہیں خستہ و آوارہ و بدنام مرے
ایک عالم نے غرض مجھکو کہا کیا کیا کچھ

طرفہ صحبت ہے کہ سُنتا نہیں تو ایک مری
واسطے تیرے سُنا میں نے سُنا کیا کیا کچھ

حسرتِ وصل و غم ہجر و خیالِ رُخِ دوست
مر گیا میں، پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

دردِ دل، زخمِ جگر، کلفتِ غم، داغِ فراق
آہ، عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ

چشمِ نمناک و دلِ پرجگر صد پارہ
دولتِ عشق سے ہم پاس بھی تھا کیا کیا کچھ

تجھکو کیا بننے بگڑنے سے زمانے کے کہ یاں
خاک کن کن کی ہوئی اور ہوا کیا کیا کچھ

قبلۂ و کعبہ، خداوند و ملاذ و مشفق
ق
مضطرب ہو کے اُسے میں نے لکھا کیا کیا کچھ

پر کہوں کیا رقمِ شوق کی اپنے تاثیر
ہر سرِ حرف پہ وہ کہنے لگا کیا کیا کچھ

ایک محروم چلے میرؔ ہمیں دنیا سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے
روشِ آبِ رواں پھیلے پھرا کرتے تھے

غیرتِ عشق کسو وقت بلا تھی ہم کو
تھوڑی آزردگی میں ترکِ وفا کرتے تھے

دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری تھی جمع
لوگ کچھ یوں ہی محبت سے دوا کرتے تھے

جب تلک شرم رہی مانعِ شوخی اُس کی
تب تلک ہم بھی ستم دیدہ حیا کرتے تھے

مائلِ کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ
دیر میں مسجدوں میں دیر رہا کرتے تھے

اب تو بیتابیٔ دل نے ہمیں بٹھلا ہی دیا
آگے رنج و تعبِ عشق اٹھا کرتے تھے

اُٹھ گئے پر مرے تکئے کو کہیں گے یاں میرؔ
دردِ دل بیٹھے کہانی سی کہا کرتے تھے

بلوا اِن دنوں ہم سے اک رات جانی
کہاں ہم، کہاں تم، کہاں پھر جوانی

شکایت کروں ہوں، تو سونے لگے ہے
مری سرگذشت اب ہوئی ہے کہانی

ادا کھینچ سکتا ہے بہزاد اُس کی
کھنچے صورت ایسی تو یہ ہم نے مانی

ہم کبھو غم سے آہ کرتے تھے   آسماں تک سیاہ کرتے تھے

اے خوشا حال اُس کا، جس کا وے   حال عمداً تباہ کرتے تھے

برسوں رہتے تھے راہ میں اُس کی   تب کچھ اک اس سے راہ کرتے تھے

کیا زمانہ تھا وُہ جو گذرا، میر

ہم دگر لوگ، چاہ کرتے تھے

اے نکیلے، یہ تھی کہاں کی ادا   کھُب گئی جی میں تیری بانکی ادا

جادو کرتے ہیں، اک نگاہ کے بیچ   ہائے رے چشم دلرباں کی ادا

دل چلے جاتے ہیں، خرام کیسا تھا   دیکھی چلنے میں ان بُتاں کی ادا

خاک میں مل کے میر ہم سمجھے

بے ادائی تھی آسماں کی ادا

دل پُر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آج
رات گذرے گی کس خرابی سے

کِھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

کام تھا عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

سُخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

زمین و آسماں زیر و زبر ہیں
نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا

کسو کے بال برہم دیکھتے میرؔ
ہوا ہے کام دل برہم ہمارا

دل عجب شہر تھا خیالوں کا
لوٹا مارا ہے حُسن والوں کا

جی کو جنجال، دل کو ہے اُلجھاؤ
یار کے حلقہ حلقہ بالوں کا

موئے دلبر سے مشکبو ہے نسیم
حال خوش اس کے خستہ حالوں کا

دم نہ لے اس کی زلفوں کا مارا
میؔر، کاٹا جیئے نہ کالوں کا

آباد جس میں تجھکو دیکھا تھا ایک مدت
اُس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا

لیتے ہی نام اس کا، سوتے سے چونک اٹھے
ہے خیر، میؔر صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا

مرے سلیقہ سے، میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں
لغزش بڑھی ہوئی تھی، ولیکن سنبھل گیا

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں، میرؔ باز آ
نادان، پھر وُہ جی سے بُھلایا نہ جائیگا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

سخت کافر تھا، جسنے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گذرا

وصل و ہجراں سے جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
دِل غریب ان میں، خدا جانے کہاں مارا گیا

سرسری تم جہان سے گُذرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

کہتے نہ تھے میرؔ، مت کُڑھا کر
دل ہو نہ گیا گُداز تیرا

لوگ جب ذکرِ یار کرتے ہیں　　دیکھ رہتا ہوں میں منہ سب کا

تھا میرؔ بھی دیوانہ، پر ساتھ ظرافت کے　　ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

دُور بہت بھاگو ہو ہم سے، سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
دردآگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

وے تو کھڑے کھڑے مرے گھر آ کے پھر گئے
میں بے دیار و بے دل و بے خانماں ہوا

کہتے تھے اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے، لیک
وہ آگیا، تو سامنے اس کے نہ آئی بات

پُھول گُل، شمس و قمر، سارے ہی تھے   پر ہمیں اُن میں تمہیں بھائے بہت

دیر و کعبہ ہیں اس کے خواہشمند   ہوتے پھرتے ہیں ہم خراب بہت
دِل کے دل ہی میں رہ گئے ارماں   کم رہا موسمِ شباب بہت

جوں سبزہ چل چمن میں، لبِ جو پہ سیر کر   عمرِ عزیز جاتی ہے آبِ رواں کی طرح

دلؔ وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے   پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کر

لہ پچھتاؤ گے بہت مرے دل کو اُجاڑ کر   اس گھر میں اور کون ہے، مہاں تمہیں تو ہو (داغ)
یہی مضمون فانی نے بھی باندھا ہے۔ دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم ۔ بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

اوّلِ کارِ محبت تو بہت سہل ہے، میر
جی سے جاتا ہے ولے، صبر و قرار آخر کار

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے، دم لیکر

تناسب پر اعضا کے، اتنا تبختر
بگاڑا تجھے، خوب صورت بنا کر
مبارک تمہیں میر ہو عشق کرنا
بہت ہم تو پچھتائے، دل کو لگا کر

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی
ہوتا ہے شوق غالب، اسکی نہیں نہیں پر

رہا پھولوں میں کرتا زمزمہ میں
مری اس باغ میں گذری سدا خوش

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شورِ جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

رہِ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ
بہت اُس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدّت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

کبھی نہ اُس رُخِ روشن پہ چھائیاں دیکھیں
گھٹائیں چاند پہ سو بار آئیاں دیکھیں
جفائیں دیکھ لیاں، بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

شکوہ کروں ہوں بخت کا، اتنے غضب نہ ہوں بتاں
مجھکو خدا نہ خواستہ، تم سے تو کچھ گلا نہیں

سمجھ کر ذکر کر آسودگی کا، مجھ سے اے ناصح
وہ میں ہی ہوں، کہ جسکو عاقبت بیزار کہتے ہیں

عجب ہوتے ہیں شاعر بھی، میں اس فرقے کا عاشق ہوں
کہ بے دھڑکے بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں

دن نہیں، رات نہیں، صبح نہیں، شام نہیں
وقت ملنے کا مگر، داخلِ ایام نہیں

ہیں طالب صورت سبھی، مجھ پر ستم کیوں اس قدر
کیا مجرمِ عشقِ بتاں، یاں ہوں خدایا ایک میں

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں
ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں

جائے ہے جی، نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں

بیخودی پر نہ میر کی جاؤ
تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

تری شورش بھی بے کل ہی مگر، میرؔ　　　ملا دی ہیں کر بجلی فغاں میں

بھر دی تھی چشمِ ساقی میں یارب کہاں کی مے
مجلس کی مجلسیں نظر اک کرتے جھک گئیں

عالم کے ساتھ جائیں چلے کس طرح نہ ہم
عالم تو کاروان ہے ہم کاروانیاں

خدا کرے کہ نصیب اپنے ہو نہ آزادی　　　کدھر کے، ہو جے جو بے بال و پر رہائی ہو

❖

حسن

(۱۷۲۷ء ÷ ۱۷۸۶ء)

میر حسن۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر ضاحک بھی اچھے شاعر تھے۔ جن سے سودا سے اکثر چشمک رہتی تھی۔ دہلی کی تباہی کے بعد دربارِ اودھ میں پہونچ گئے اور پہلے فیض آباد، پھر لکھنؤ میں رہے۔ ان کی مثنوی "سحر البیان" اسم با مسمّٰی ہے۔ اس میں واقعات اور جذبات کی جیسی تصویریں نظر آتی ہیں وہ اردو کی کسی اور مثنوی میں نہیں ہیں۔ اختصارِ بیان اس کی ایک خاص صفت ہے۔ اشاروں میں مکمّل تصویریں کھینچ جاتے ہیں۔ غزلیں بھی اُستادانہ اور پُر لطف ہیں۔ جن کا نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

میر حسن کے خاندان کے احسانات اردو زبان پر بہت ہیں۔ ان کے پوتے میر انیس نے اپنے مرثیوں کے ذریعہ اردو شاعری کو ایک ایسی بلندی پر پہونچایا جو آج تک یادگار ہے۔

دیکھ آئینہ میں عکسِ رُخِ جاناں نہ جدا
میں جُدا محو ہوا، اور دلِ دیوانہ جُدا

آہ کیا جانئے محفل میں یہ کس کی خاطر
شمع روتی ہے جُدا، جلتا ہے پروانہ جدا

شرکتِ شیخ و برہمن سے میں نکلا جب سے
کعبہ سونا ہے جُدا، خالی ہے بتخانہ جُدا

جب ہوئے ہم ہیں جدا اس سے تو کچھ کام نہیں
غیر اُس شوخ سے اب ہووے جدا یا نہ جُدا

اس کو اُمید نہیں ہے کبھی پھر بسنے کی
اور ویرانوں سے اِس دل کا ہی ویرانہ جُدا

گوشۂ چشم میں بھی مردمِ بد بیں ہیں حسن
واسطے اس کے بنا دل ہیں نہاں خانہ جُدا

روروکے کیا ابتر سب کام مرے دل کا — کھویا مری آنکھوں نے آرام مرے دل کا

آغازِ محبت ہیں دیکھا تو یہ کچھ دیکھا — کیا جانئے کیا ہوگا انجام مرے دل کا[1]

جس دن سے ہوا پیدا اس دن سے ہوا شیدا — دیوانہ و سودائی ہے نام مرے دل کا

طوفان ہے زلفوں پر بہتان ہے کاکل پر — ہے رشتۂ الفت ہی پردام مرے دل کا

معشوق کی الفت سے مت جان حسنؔ خالی
لبریزِ محبت ہے یہ جام مرے دل کا

آتشِ غم نے ملکِ دل پھونک دیا جلا دیا
باقی جو کچھ کہ رہ گیا اشک نے لے بہا دیا
کہتے تھے ہم کہ روزِ ہجر کہتے ہیں کس کو کیا ہے چیز
ہائے فلک نے سو وہ دن آج ہمیں دکھا دیا

---

[1] ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا (میر)

ایک ہی چراغِ دل جلتا تھا میرے حال پر
آہِ سحر نے میری آہ اُس کو بھی اب بُجھا دیا

میکشوں میں تو شیخ آج آہی پھنسا تھا شکر کر
داڑھی پہ تیری رحم کر، ہمنے تجھے بچا دیا

ٹکڑے جگر ہے کیوں ترا غنچہ کی طرح اے حسن
زہرِ غمِ فراق کا کس نے تجھے پلا دیا

مزا بیہوشیٔ اُلفت کا ہشیاروں سے مت پوچھو
عزیزاں، خواب کی لذت کو بیداروں سے مت پوچھو

ہمیں کچھ دخل ان باتوں میں، سُنتے ہو نہیں مطلق
حقیقت بیوفائی کی وفاداروں سے مت پوچھو

جو پوچھو تو عزیزاں دل سے پوچھو یا کہ تم ہم سے
ہماری اور اُس کی بات اغیاروں سے مت پوچھو

گئے وے دن جو رہتے تھے جہان آباد میں ہم بھی
خرابی شہر کی صحرا کے آواروں سے مت پوچھو

گلوں کو کب خبر ہے حال زار عندلیباں سے
حقیقت مفلسوں کی آہ زرداروں سے مت پوچھو

وہ دل رکھتے ہیں اپنا پاس اپنے بلکہ غیروں کا
حقیقت بے دلوں کی، آہ، دلداروں سی مت پوچھو

خبر دل کی اگر چاہو مرے اشکوں سے تم سن لو
یہ واقف خوب ہیں اس گھر سی، ہرکاروں سی مت پوچھو

انہوں کا جل رہا ہی دل، خدا جانے کہ کیا بولیں
مرا احوال کوئی میرے غمخواروں سے مت پوچھو

یہ اپنے حال ہی میں مست ہیں، ان کو کسی سی کیا
خبر دنیا و ما فیہا کی میخواروں سے مت پوچھو

ہوا ہے ان دِنوں وُہ آشناؤں سے بھی بیگانہ
خرابی کو حسن کی آجکل یاروں سے مت پوچھو

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو کیا غضب کرتے ہو اِدھر دیکھو
دیکھنا زلف و رخ تمہیں ہر وقت شام دیکھو، نہ تم سحر دیکھو
گُل ہوئے جاتے ہیں چراغ کی طرح ہم کو ٹک جلد آن کر دیکھو
آپ پر اپنا اختیار نہیں جبر ہے ہم پہ کس قدر دیکھو
رام باتوں ہیں تو وُہ ہو نہ سکا نقش و افسوں بھی کوئی کر دیکھو
وصل ہوتا نہیں بھلا کیونکر اپنی ہستی سے تو گذر دیکھو
دیکھتے ہی نہیں تو کیا کہئے کہئے تب حال کچھ اگر دیکھو
عشق بازی سے باز آؤ حسن
چھوڑ دو اپنا یہ ہنر دیکھو

دَورِ اوّل کے چند اور شعراء

آرزو۔ سراج الدین خان آرزو۔ ان کے علم و فضل کے سب قائل تھے۔ چنانچہ میر تقی میر لکھتے ہیں :۔

"آب و رنگِ باغ نکتہ دانی۔ چمن آرائے گلزار معانی ......
چراغِ دودمانِ صفائے گفتگو کہ چراغش روشن باد۔ سراج الدین علیخان آرزو سلمہ اللہ تعالیٰ ابداً۔ شاعر زبردست قادر سخن، عالم فاضل ...."

خان آرزو کا فارسی اور اردو کا کلام افسوس ہے کہ ہم تک نہیں پہونچا۔ لیکن ان کا اثر اپنے زمانہ کے شعرا پر بہت گہرا پڑا ہے وہ البتہ

روشن ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

جان تم پر کچھ اعتماد نہیں
زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

ہر صبح آ وتا ہے تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

آرزو نے سکندر نامہ، قصائدِ عرفی اور گلستانِ سعدی کی شرحیں لکھیں۔ ایک لغت فارسی اور ایک لغت اردو کے علاوہ شعرائے دکن کا ایک تذکرہ بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔

آبرو۔ نجم الدین عرف شاہ مبارک، وطن گوالیار تھا۔ لیکن جوانی میں

دہلی آ گئے۔ شعر و سخن میں خان آرزو سے مشورہ کرتے تھے۔ شوخ مزاج اور بذلہ سنج کہلاتے تھے۔ غزلیات کے علاوہ مثنوی "آرائشِ معشوق" مشہور ہے۔

نمونۂ کلام :۔

آیا ہے صبح نیند سے اٹھ رسمسا ہوا
جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

جدائی کے زمانہ کی میاں کیا زیادتی کہیئے
کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گذری سو جگ بیتا

دور خاموش بیٹھ رہتا ہوں
اس طرح حال دل کا کہتا ہوں

کریں جو بندگی ہو دیں گنہگار
بتوں کی کچھ نرالی ہے خدائی

تجھ اوپر خون بے گناہوں کا ‏ ‏ چڑھ رہا ہے شراب کی سی طرح

اب دین ہوا زمانہ سازی ‏ ‏ آفاق تمام دہریا ہے

زندگانی تو ہر طرح کاٹی ‏ ‏ مر کے پھر جینا قیامت ہے

حسن ہے، پر خوبرویوں میں وفا کی خو نہیں ‏ ‏ پھول ہیں یہ سب پر ان پھولوں میں ہرگز بو نہیں

مضمون :- میر شرف الدین۔ اکبر آباد کے قریب قصبہ جاجمو' کے باشندے تھے۔ لیکن دہلی میں آبسے۔ میر تقی میران کو "حریف ظریف، ہشاش بشاش، ہنگامہ گرم کن مجلسہا" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اور سودا کہتے ہیں ؎

بنائیں اٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی ‏ ‏ گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو ستانا

نمونہ کلام :۔

چلا کشتی میں آگے سے جو وُہ محبوب جاتا ہے
کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھو جی ڈوب جاتا ہے

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں
ایک تو گل بیوفا اور تس پہ جور باغباں

ناجیؔ :۔ محمد شاکر، یہ اپنی ہزل گوئی کے لئے زیادہ مشہور تھے لیکن غزلیات
بھی موجود ہیں، سادہ و پُر اثر ؎

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم
لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب

گر سلیماں کا تخت دیں، مت لے
کہ سب آخر کو جائے گا برباد

کرے کرم اے مہرباں پھر ہم کہاں اور تم کہاں
نئیں دیکھ سکتا آسماں پھر ہم کہاں اور تم کہاں

یکرنگ : مصطفیٰ خاں، شاہ مبارک آبرو کے ہمعصر دوست تھے۔ کلام انہیں کے طرز کا ہے۔

خلق یکرنگ کی ہوئی دشمن   جب سے تیرا وہ دوستدار ہوا

یاد آتی ہے تازگیٔ بہار   دیکھ ہر خشک خار کی صورت

پارسائی اور جوانی کیونکہ ہو   ایک جاگہ آگ پانی کیونکہ ہو
نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے   دل سے صبر و قرار جاتا ہے

جگر کسی کا جلے، دل جلے، دماغ جلے ‏ ‏ وہ کہہ گئے ہیں کہ آئیں گے ہم چراغ جلے

یقین :- انعام اللہ خاں، مرزا مظہر جانِ جاں کے عزیز شاگرد تھے۔ عین شباب کے زمانہ میں تقریباً ۱۷۵۴ء میں قتل ہو گئے۔ اگر زندہ رہتے ضرور اساتذہ میں شمار کئے جاتے۔ دیوان مرزا فرحت اللہ بیگ کا مرتب کیا ہوا ملتا ہے۔ یقین کے کلام میں ایک انوکھی شوخی اور نرالا بانکپن پایا جاتا ہے جو اپنے زمانہ کے عام رنگ سے علیحدہ ہے ؎

نہیں معلوم اب کی سال میخانہ پہ کیا گذرا ‏ ‏ ہمارے توبہ کر لینے سے پیمانہ پہ کیا گذرا

برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے ‏ ‏ خدا جانے تری صورت سے بتخانہ پہ کیا گذرا

مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالوں نے ‏ ‏ نہیں معلوم میرے بعد ویرانہ پہ کیا گذرا

یقین کب یار میرا سوزِ دل کی داد کو پہنچے
کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانہ پہ کیا گذرا

سر پر سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

مجھے زنجیر کرنا کیا مناسب تھا بہاراں میں
کہ گُل ہاتھوں میں اور پاؤں میں میرے خار بہتر تھا

ہموں نے ہجر سے کچھ وصل میں دھڑکے بہت دیکھے
ہمارے حق میں اس راحت سے وہ آزار بہتر تھا

مرا دل مر گیا جس دن کہ نظّارہ سے باز آیا
یقیںؔ پرہیز اگر کرتا تو یہ بیمار بہتر تھا

جب دیکھتا ہوں تجھ کو تنہا سجن چمن میں
کس کس طرح کی باتیں آتی ہیں میرے من میں

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ دل کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

خُوباں یقیںؔ کو معذور اب تو رکھو کہ اس کے
لوہو نہیں جگر میں آنسو نہیں نین میں

قُدرت :- شاہ قدرت اللہ۔ شاگرد مرزا مظہر جانِ جاں ؒ

کس کی نیرنگی پہ برقِ شعلۂ فانوس ہے — جو شرر اس میں سے اُٹھا جلوۂ طاؤس ہے

صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے — اب وداعِ ننگ ہے اور رُخصتِ ناموس ہے

حُسن کو اپنے ہواداروں سے ہے کاوش مدام — ہر طپش یاں شمع کی برقِ دلِ فانوس ہے

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — ق — کیا ہے ملکِ روم کیا ہی سرزمینِ طوس ہے

گر بہ بستر ہو تو کیا عشرت سے کیجے زندگی — اس طرف آوازِ طبل، اُودھر صدائے کوس ہے

صبح سے تا شام چلنا ہوئے گُلگوں کا دور — شب ہوئی تو ماہ رُویوں سے کنار و بوس ہے

سنتے ہی عبرت یہ بولی، اک تماشہ میں تجھے — چل دکھاؤں، تو جو قیدِ آز کا محبوس ہے

لے گئی اک بارگی گورِ غریباں کی طرف — جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے

مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے، یہ دارا ہے، یہ کیکاؤس ہے

پُوچھ لو اِن سے کہ جاہ و حشمتِ دُنیا سے آج — کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے

ایک ہی پردے کے یہ سب سمجھے تو ہیں الاپ — گر صدائے جنگ ہے یا نغمۂ ناقوس ہے

کل تو قدرت پائے خُم رکھی تھی تسبیحِ ریا — آج رہنِ جامِ مے یہ خرقۂ سالوس ہے

بیدار :- میر محمدی، پہلے شاہ حاتم پھر خواجہ میر دردؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ آخر عمر میں دہلی سے آگرہ چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔ کلام میں پختگی اور پاکیزگی ہے۔

عجب عالم ہے مستی کا، اہاہاہا، اہاہاہا
مے و ساقی ہیں سب یکجا، اہاہاہا، اہاہاہا

ہوا شورِ جنوں برپا، اہاہاہا، اہاہاہا
بہار آئی تڑانے پھر لگے زنجیر دیوانے

جن آنکھوں نے نہ دیکھا تھا کبھی اک اشک کا قطرہ
رواں ہے اُن سے اب دریا، اہاہاہا، اہاہاہا

کس پری رو نے کیا میرے گذر آنکھوں میں
کہ ٹھہرتا نہیں ہے کوئی بشر آنکھوں میں

دن ہوا، دیکھئے کس طرح سے گذرے تا شام
رات تو کاٹی ہے میں تا بہ سحر آنکھوں میں

دور سے بات خوش نہیں آتی
یوں ملاقات خوش نہیں آتی

تو نہ ہووے تو اے مہِ تاباں
چاندنی رات خوش نہیں آتی

اس کے مذکور کے سوا بیدار   اور کچھ بات خوش نہیں آتی

ربط جو چاہیئے، بیدار، سو اس سے معلوم   مگر اتنا کہ مُلاقات چلی جاتی ہے

بقاؔ:۔ شیخ بقاء اللہ اکبرآبادی پہلے حاتمؔ اور پھر خواجہ میر دردؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ ہر مشاعرہ میں میرؔ اور سوداؔ سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ کلام استادانہ ہے

خواہشِ سُود تھی سودے میں محبّت کے دلے
سر بسر اس میں زیاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا
میں تو آیا تھا بقاؔ، باغ میں سُن جوشِ بہار
پر یہ ہنگام خزاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

سپاہِ عشرت پہ فوجِ غم نے جو دل کے مرکب بہم اٹھائے[1]
اُدھر تو نالے کا تاشہ کڑ کا، ادھر فغاں نے علَم اُٹھائے

---

[1] دلے کز شکرِ غم صف کشد بہ خونخواری   دلم بہ نالہ دہد منصبِ عَلَمداری   (عرفی)

تہی کف آئے تھے ہم عدم سے، چلے بھی یاں سے تو دست خالی
نہ توشہ واں سے یہاں تھا آیا، نہ ساتھ یاں سے درم اٹھائے

بقا جو راہی ہوئے عدم کے، تو وقفہ ہرگز کرو نہ دم کا
یہ راہ ہستی کی پُر خطر ہے، چلو یہاں سے قدم اُٹھائے

اثر :- میر محمد، خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی اور شاگرد تھے۔ ان کی مثنوی 'خواب و خیال' اردو زبان کی پہلی مشہور مثنوی ہے۔ غزلوں کے اشعار کا نمونہ یہ ہے ؎

وائے غفلت کہ ایک ہی دم میں ہیں کہیں اور کارواں کہیں

بےؔ وفائی پہ تیری جی ہے فدا قہر ہوتا جو باوفا ہوتا

ؔ ہزاروں جان دیتے ہیں تمہاری بیوفائی پر اگر ان میں سے کوئی باوفا ہوتا تو کیا ہوتا (چکبست)
دشمنی پر بھی پیار آتا ہے دوست ہوتے تو جانے کیا ہوتا (امیر)

کبھی دوستی ہے کبھی دشمنی　　تری کون سی بات پر جائیے

وہی میں ہوں، وہی اثر دل ہی　　اب خدا جانے کیا ہوا مجھکو

ہم آگو ہی سمجھے تھے تم گھر کو سدھارو گے　　جوں صبح گجر باجا تا تھا وہیں ٹھنکا تھا

راسخ :- حافظ عبدالرحمن۔ شاگرد مولوی محمد حسین فقیر ؎

کہاں تھے شب؟ ادھر دیکھو، حیا کیوں ہے نگاہوں میں
اگر منظور ہے، رکھ لو مجھے جھوٹے گواہوں میں
موحد وہ ہوں گر میں سرِ وحدت کان میں کہہ دوں
موذن تبکدہ میں ہوں، برہمن خانقاہوں میں

نظر مجھ سے چُرا کر، منہ چھپا کر کہتے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں

سیہ کاری مری بن جائے رشکِ گیسوئے خُوباں
قیامت کو چُھپا بیٹھا رہوں یارب، گناہوں میں

وہی راسخ تو ہیں کل تک جو میخانے کے درباں تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

سراج
۱۷۱۰ء-۱۷۶۶ء

سید سراج الدین، اورنگ آباد کے شعرا میں ولی کے بعد سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ دیوانِ فارسی اور مجموعۂ غزلیاتِ اردو کے علاوہ ایک مثنوی بوستانِ خیال مشہور ہے۔ نمونۂ کلام ؎

خبرِ تحیرِ عشق سُن نہ جنُوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا، مجھے وہ لباسِ برہنگی — نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سُرور کا جل گیا — مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں — کہ شرابِ صد قدح آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا — کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی تیوں ہی دھری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بینوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا، مگر ایک بے خطری رہی

پی بِن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی
جس رات چاند نئیں ہے ستاروں کی کیا کمی

بابِ سوم، لکھنؤ کی شاعری کا پہلا دَور

(اٹھارہویں صدی کا آغاز)

نادر شاہ کے حملہ سے لے کر تقریباً ایک سو سال تک دہلی میں بالکل تاریکی کا دور تھا۔ اس زمانہ کی تاریخوں میں چند لڑائیوں کا ذکر ہے۔ چند لُٹیروں اور ڈاکوؤں کے کارنامے ہیں، دربار کی سازشیں ہیں غلام قادر کے کرتُوت ہیں۔ مرہٹے ہیں، انگریز ہیں اور بہت سے عبرت انگیز واقعات ہیں جنہیں اگر یکجا کیا جائے تو دفتر مرتّب ہو جائیگا۔ لیکن تاریخ کی رسمی کتابوں میں پوری ایک صدی کے حالات اکثر صرف چند

صفحوں میں لکھے جاتے ہیں اس لئے کہ ان واقعات کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی جاتی ؎

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا — مگر کبھو کسو عاشق کا یہ نگر دل تھا

کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا — عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا

کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

(سودا)

اسی دور میں زمانہ کے حالات سے تنگ آکر دہلی کے اکثر اربابِ کمال وطن کو چھوڑ کر فیض آباد اور پھر لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ جہاں دربار اودھ میں شعر و شاعری کی قدر دانی ہوتی تھی۔ ان میں سودا، میر، میر حسن، مصحفی، جرأت اور انشا خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

میر تقی میر جب لکھنؤ پہونچے اور وہاں کے خوش و خرّم، جیتے جاگتے ہنستے بولتے لوگوں نے ان کی وضع قطع دیکھ کر آوازے کسے تو انہوں نے یہ قطعہ پڑھا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب		رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا		ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

میر تقی میرؔ، سوداؔ، اور میر حسنؔ کو ہم دورِ اوّل ہی میں شامل کر چکے ہیں۔ ان کا بڑھاپا جرأتؔ مصحفیؔ، انشاؔ اور رنگینؔ کے شباب کا زمانہ تھا۔ جب شاعروں کی محفل دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوئی تو وہاں پہونچتے ہی اس کا رنگ دوسرا تھا۔ دہلی میں حسرت و یاس کے مضامین سننے میں آتے تھے۔ لکھنؤ میں عیش و نشاط کے گیت الاپے جانے لگے۔ سیّد انشاؔ کے چٹکلے اور لطیفے تھے۔ جرأتؔ کی شوخیاں اور شرارتیں، میر حسنؔ کی مثنوی میں محلوں کی چہل پہل، آرائش و زیبائش، بیگمات کے لباس و زیورات، خواصوں اور سہیلیوں کے ناز و انداز، چُہلیں شرارتیں غرض کہ دربار کی شاعری کا پورا سامان نظر آتا ہے۔ رفتہ رفتہ مخصوص طرز لکھنؤ کی غزل گوئی کی شاعری وُجود میں آئی۔ جس کو آپ دربارِ اودھ کی شاعری کے باب میں دیکھیں گے۔ اس کے آثار میر حسنؔ، جرأتؔ، انشاؔ اور رنگینؔ کے زمانہ ہی میں ظاہر ہو چکے تھے۔

جُرأت

(۱۷۴۵ء تا ۱۸۱۰ء)

شیخ قلندر بخش، دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں فیض آباد چلے گئے۔ اور وہاں سے لکھنؤ۔ دربارِ اودھ کے زیر سایہ عمر بسر کی۔ جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ اپنے عاشقانہ کلام کی رنگینی اور چٹخارہ کے باعث استاد سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ساتھ ساتھ ان کا سنجیدہ کلام بھی موجود ہے۔ جس نے غالباً میر، سودا، میر درد اور مصحفی کے کلام کے سامنے فروغ نہ پایا۔ غزلیں جو مشہور رہیں یا انتخابات میں پائی جاتی ہیں وُہ شوخ عاشقانہ رنگ کی ہیں۔ ایک مکمل قلمی دیوان جو برٹش میوزیم میں موجود ہے اس سے کچھ انتخاب سنجیدہ رنگ کا بھی پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ ان کا مشہور کلام

ان کی شاعری کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔

مشہور رنگ:-

کل واقفِ راز اپنے سے کہتا تھا وُہ یہ بات ق جراُت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر جو بات نہ تھی ماننے کی، مان گئے ہم

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے، خدا کے واسطے، مت کر نہیں نہیں
کیا رک کے وُہ کہے ہے جو ٹک اس سی لگ چلوں
بس بس پرے ہو، شوق یہ اپنے تئیں نہیں
فُرصت جو پا کے کہئے کبھو دردِ دل، سو ہائے
وُہ بدگماں کہے ہے کہ ہم کو یقیں نہیں
آتش سی پھک رہی ہے مرے تن بدن میں آہ
جب سے کہ روبرو وُہ رُخِ آتشیں نہیں

کیاؐ جانے کیا وُہ اس میں ہے، لوٹے ہے جس پہ دل
یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں

ہر چند ہے یہ لُطفِ شبِ ماہ و سیرِ باغ
اندھیر پر یہی ہے، کہ وُہ مہ جبیں نہیں

حیرت ہے مجھ کو کیونکہ وُہ جرأت، ہی چین سے
جس بِن قرار جی کو ہمارے کہیں نہیں

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسایہ ہیں آپ آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں، گھبرائے ہوئے

آپ سے میں تو نہ جاؤں، پہ کروں کیا کہ وہیں
دلِ بے تاب لئے جائے ہے دوڑائے ہوئے

آج بھی اس کے جو آنے کی نہ ٹھیری، تو بس آہ
ہم وُہ کر بیٹھیں گے جو دل میں ہیں ٹھیرائے ہوئے

ؐ سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وُہ
کیا جانیئے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا (سودا)

ابرِ تصویر کی مانند، ہم اُس محفل میں
رو نہیں سکتے پہ آنکھوں میں ہیں اشک آئے ہوئے

لوگ گر ہم سے یہ کہتے ہیں کہ چلتے ہو جی واں
ق
اپنے بیگانے سب اس بزم میں ہیں آئے ہوئے

دل میں تب سوچ کے اس بات کو فرد دیتے ہیں
کیا کہیں اُن سے کہ ہیں ہم تو نکلوائے ہوئے

بیخودی پر نہ ہماری متحیّر ہو کوئی
آئیں کیا آپ میں جی ہم ہیں کہیں آئے ہوئے

دمِ رخصت کہے جرأت کوئی اس کافر سے
اِک مسلماں کو کیوں جاتے ہو تڑپائے ہوئے

ہمیں دیکھے سے وہ جیتا تھا اور ہم اس پہ مرتے تھے
یہی راتیں تھیں اور باتیں تھیں، وہ دن کیا گذرتے تھے

وہ سوزِ دل سے بھر لاتا تھا اشکِ سرخ آنکھوں میں
اگر ہم جی کی بے چینی سے آہِ سرد بھرتے تھے

ف مومن کی مشہور غزل "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" اور ہوس کی غزل "آتے تھے جاتے تھے" سے مقابلہ کیجئے۔

بیاں ہم وصل میں کرتے جو دردِ ہجر سے مرنا
تو وُہ کہتا خدا شاہد ہے اس کا، ہم بھی مرتے تھے

کسی دھڑکے سے روتے تھے جو باہم وصل کی شب کو
وُہ ہم کو منع کرتا تھا، ہم اس کو منع کرتے تھے

ملی رہتی تھیں نظریں غلبۂ اُلفت سے آپس میں
نہ خوف اس کو کسی کا تھا، نہ ہم لوگوں سے ڈرتے تھے

سو اَب صد حیف اس خورشید رُو کے ہجر میں جرأت
یہی راتیں ہیں اور باتیں ہیں، وُہ دن کیا گذرتے تھے

برنگِ مہر ہیں، گردش ہے ہم کو سارے دِن
جو تم پھر آؤ تو پیارے پھریں ہمارے دِن

نہیں ہے تیرے مریضانِ ہجر کا چارہ
اب اپنی زیست کے بھرتے ہیں یہ بچارے دِن

بوصل کیونکہ مبدّل ہوں ہجر کے ایام
مگر خدا ہی یہ بگڑے ہوئے سنوارے دِن

رہے تھا جبکہ ہم آغوش مجھ سے وُہ پیارا عجب مزے کی تھیں راتیں، عجب تھے پیارے دِن
کب ہو گی اُس سے مُلاقات، میں یہ پوچھوں ہوں ذرا تو دیکھ نجومی، مرے ستارے دِن
شبِ وصال میں پروانہ ساں تمام ہوئے فراقِ یار کا دیکھا نہ ہم نے بارے دِن
لگا یہ روگ جوانی میں کیوں میاں جرأت
ابھی تو سیر تماشے کے تھے تمہارے دِن

کوئی یاں اُس کو لے آوے بُلا کے بہانے سے کسی اور آشنا کے
ہزار افسوس، یوں اے زِندگانی چلی تو خاک میں ہم کو مِلا کے
چلی مُنہ موڑ کر تو، اے جوانی ہمیں یہ ولولے اپنے دکھا کے
غضب ہے، لیتے ہی آغوش میں ہائے وُہ اُس کا سانس لینا کسمسا کے
میاں! تیغِ تغافل سے نہ مارو کہ ہیں آگے ہی ہم مارے خدا کے
نگاہِ یار ہے یوں جانبِ دِل نشانے کو کوئی جیسے کہ تاکے

بتوں کے عشق میں دی جان جرأت
کیا کیا تو نے اے بندے خدا کے

ہم نشیں ہو گئے رقیب اپنے
کیا گلہ کیجئے، نصیب اپنے

یاد آتا ہے مجھ کو بھی وہ گُل
مت سُنا نالے، عندلیب اپنے

نہیں اب کوئی جُز غم واندوہ
ہیں یہی ہمدم و رقیب اپنے

نہ ملے اب تو کیا کریں جرأت
گرچہ ہے وہ بہت قریب اپنے

نہ تنہا دل خرامِ ناز پر ہر آن لوٹے ہے
ترا دامن بھی قدموں پر ترے اے جان لوٹے ہے

گیا ہے چھوڑ کر تو جس کو اے آبادئ عالم
وہ مضطر کیا در دِن خانۂ ویران لوٹے ہے

کرے ہے چاندنی کی سیر جب وہ بیٹھ کشتی میں

تو کیا کیا موج پر عکسِ مہِ تابان لوٹے ہے

گرے ہے جبکہ تیرے مضطرب کی چشم سے آنسو

تو کیا کیا خاک پر جوں گوہرِ غلطان لوٹے ہے

خفا مجھ سے نہ ہو گر لوٹ جاؤں تیرے قدموں پر

کروں میں کیا کہ تجھ پر دل مرا اے جان لوٹے ہے

اور آتا ہے جو سونا یاد باہم بسترِ گل پر

تو ساری رات انگاروں پہ دے دے جان لوٹے ہے

کہے اشعار بے تابی کے تو نے ایسے اے جرأت

کہ پڑھ کر ہر سخنداں اب ترا دیوان لوٹے ہے

سنجیدہ رنگ

میں وہ طوفان چشم تر دیکھا　　　ابر تر کو بھی جس سے تر دیکھا

اک مجھی میں نہیں ہے خاک بھی کچھ — خاک ہیں ورنہ مال و زر دیکھا

جس طرف دیکھتا ہوں میں اُس بن — یہ نہیں جانتا کدھر دیکھا

موت ہی اب تو زیست ہے کہ بہت — دردِ دل کا علاج کر دیکھا

روئے تجھ بن یہ شب کہ آنکھوں کا — اور ہی رنگ، تا سحر دیکھا

منزلِ بیخودی میں آپ کو بھی — ہم نے اپنا ہی ہم سفر دیکھا

ہم نے ملکِ عدم سے ہستی میں — کیا تماشہ نہ آن کر دیکھا

دردؔ کی طرح جان جرأت کو
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

بتاؤں ہم نفساں کیا میں گلستاں کی خبر — قفس میں مجھکو نہیں اپنے آشیاں کی خبر

ترے خیال میں دونوں جہاں سے ہم گذرے — نہ اس جہاں کی خبر ہے نہ اُس جہاں کی خبر

مثالِ شمع کریں سوزِ دل بیاں کیا خاک — زبان رکھتے ہیں، لیکن نہیں زباں کی خبر

خدا ہی جانے ترے جانؔ دِل پہ کیا گذری　　نہ اِس مکیں کی خبر ہے نہ اُس مکاں کی خبر

برنگِ بُلبلِ تصویر، کیا کہوں تجھ سے　　نہ اپنی مجھکو خبر ہے نہ گلستاں کی خبر

ترے فراق میں جرأت نے جی دیا اے شوخ

ہزار حیف نہ لی تو نے اس جواں کی خبر

شبِ فرقت بلا ہی بھاری تھی　　بچ گئے، زندگی ہماری تھی

دل ٹھہرتا ہی تھا نہ اُس بِن رات　　بیقراری سی بیقراری تھی

مر گئے ہجرِ یار میں صد شکر　　جیتے رہتے، تو سخت خواری تھی

ہوتا تھا اپنے جانے سے جس کو قلق، سو ہائے

گھبرا کے آج کیا مرے آنے سے اُٹھ گیا

ہمدم نہ مجھ کو قصۂ عیش و طرب، سُنا

مدت سے دل کچھ ایسے فسانے سے اُٹھ گیا

اُس کے جانے سے یہ دل میں آئے ہے، رہ رہ کے، ہائے
سب جہاں بستا ہے، اک اپنا ہی گھر ویراں ہوا

ہے جو دیوانِ حسرت، اے جرأت   اُسی خرمن کا خوشہ چیں ہوں میں

ہم اس طرح سے ہیں یارانِ رفتگاں سے دُور
غریب جوں کوئی رہ جائے کارواں سے دُور
چمنؔ دکھایا نہ صیّاد نے کبھی ہم کو
رکھا قفس کو بھی دیوارِ گلستاں سے دُور

ؔ اُداس دیکھ کے مجھکو چمن دکھاتا ہے   بہت دنوں میں ہوا ہے مزاج داں صیّاد (رندؔ)

مصحفی

(۱۷۴۹ء تا ۱۸۲۴ء)

شیخ غلام ہمدانی، مصحفی۔ امروہہ کے رہنے والے تھے۔ لڑکپن میں دہلی چلے آئے تھے اور وہاں سے کچھ عرصہ کے بعد دوسرے شعرا کی طرح یہ بھی لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ مصحفی صاحبِ علم تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ایک "تذکرۂ شعرائے اردو" مرتب کیا تھا جس میں تین سو سے زائد شاعروں کا حال ہے۔ مصحفی نہایت پُرگو شاعر تھے اس لئے ان کے کلام میں بہت سے اشعار بھرتی کے ہوتے تھے لیکن اِن کی منتخب غزلیں صفِ اوّل کے اساتذہ کے کلام

سے ٹکر لیتی ہیں۔ اور ان کی استادی مسلّم الثبوت ہے۔

مصحفی کے شاگردوں کی تعداد بہت بڑی تھی، جن میں آتش، خلیق، ضمیر، اسیر، شہیدی، ہوس اور غافل مشہور ہوئے۔

جی جائیگا رائیگاں کسی کا — یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا

مکھڑے سے نقاب مت اُٹھاؤ — کیا فائدہ، ہو زیاں کسی کا

جز آہ وہاں کوئی کرے کیا — کچھ بس نہ چلے جہاں کسی کا

ہو دیکھ فرشتہ اُس پہ عاشق — ہوتا ہے وُہ بدگماں کسی کا

آزردہ کریں ہیں اس طرح واہ — دل مفت میں او میاں کسی کا

اے مرغِ چمن، یہیں نہ کر شور — میراث ہے گلستاں کسی کا

تا فصلِ دگر رہا نہ ہرگز — اس باغ میں آشیاں کسی کا

دیتے نہیں مصحفی پھر اُس کو
دل لیویں جو یہ بُتاں کسی کا

یوں تو دنیا میں کیا نہیں ملتا — پہ دلِ باصفا نہیں ملتا
اور سب کچھ ملے ہے دُنیا میں — لیکن اک آشنا نہیں ملتا
دلِ دیوانہ رات سے گُم ہے — کہیں اُس کا پتا نہیں ملتا
شیخ کلبہ سے اُٹھ نکل باہر — گھر میں بیٹھے خدا نہیں ملتا
دردوغم کو بھی ہے نصیبہ شرط — یہ بھی، قسمت سوا نہیں ملتا
اک نے پوچھا کہ مصحفیؔ سے بھلا — ق — کیوں تو اے بیوفا نہیں ملتا
ہنس کے بولا کہ او میاں اُس سے — کیا کروں، دل مرا نہیں ملتا

ہم تو چمکتے ہی ہوا ہو گئے — مثلِ شرر، دم میں فنا ہو گئے
مجلسِ ہستی میں جو آئے تھے یار — یہ نہیں معلوم وُہ کیا ہو گئے
رشک ہے اوقات پراُن کے مجھے — موسمِ گل میں جو رہا ہو گئے
سیرِ چمن کی نہ دلا ہم کو یاد — وُہ بھی دن اے بادِ صبا ہو گئے

وصل میں جیوں جیوں مزا پاتا ہے جی
ساتھ باتوں کے چلا جاتا ہے جی

کون مجھ سے رُک رہا ہے اِن دِنوں
بیٹھے بیٹھے کیوں رُکا جاتا ہے جی

جی اگر جاوے کسی کا، بے گناہ
آپ کا سچ ہے، کہ کیا جاتا ہے جی

ہجر کے غم کو کہاں تک جھیلئے
آہ اپنا تو کھپا جاتا ہے جی

ذکر اس کی چال کا جب آئے ہے
سُننے والوں کا رُندھا جاتا ہے جی

حسرت پہ اُس مسافرِ بیکس کی روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

افسوس کی جگہ ہے، کہ دریائے عشق میں
کیا کیا غریب ڈوبے ہیں، ساحل کے سامنے

جی سے مجھے چاہ ہے کسی کی　　　کیا جانے کوئی کسی کے جی کی
شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر　　　جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی
رونے پہ مرے جو تم ہنسو ہو　　　یہ کون سی بات ہے ہنسی کی
گو اب وُہ جواں نہیں پہ ہم سے　　　لت جاتی ہے کوئی عاشقی کی
کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا
بُو آتی ہے اس میں فارسی کی

۱

دیکھ اُس کو یک آہ ہم نے کرلی　　　حسرت سے نگاہ ہم نے کرلی
کیا جانے کوئی کہ، گھر میں بیٹھے　　　اس شوخ سے راہ ہم نے کرلی
بندہ پہ نہ کر کرم زیادہ　　　بس بس تری چاہ ہم نے کرلی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا
کج اپنی کُلاہ ہم نے کرلی

جب واقفِ راہ و روشِ ناز ہوئے تم
عالم کے میاں خانہ برانداز ہوئے تم

نسبت تمھیں کیا تازہ نہالانِ چمن سے
اب نامِ خدا سروِ سرافراز ہوئے تم

اے مصحفی مُرغانِ چمن رہ گئے خاموش
جب باغ میں جا زمزمہ پرداز ہوئے تم

اس دل میں تیرے ملنے کا ارمان رہ گیا
یہ دل تڑپ تڑپ کے مری جان رہ گیا

دُنیا سے ہم چلے گئے ناچار مصحفی
اک یادگار، اپنا یہ دیوان رہ گیا

ترے کوچہ اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا

صبح کی شام ہوئی، شام کی پھر رات ہوئی
یہی وعدے ہیں، تو کب اُن سے ملاقات ہوئی

آہ نکلی تو دل سے ہے، لیکن　　　آہ کیا جی جلا کے نکلی ہے

تو دیکھے تو اک نظر بہت ہے　　　اُلفت تری اس قدر بہت ہے

ہائے کعبہ سے پھرا اب تک نہ ہرگز مصحفی
اُس کو واں کیا جانئے کس بت سے محبت ہوگئی

⁘

انشاؔ

(۱۷۵۳ء تا ۱۸۱۷ء)

سید انشاء اللہ خاں۔ مرشد آباد میں پیدا ہوئے لیکن بچپن ہی میں دہلی آ گئے تھے۔ عربی، فارسی اور ہندی زبانوں میں اعلیٰ استعداد رکھتے تھے۔ ان کی ہمہ گیر ذہانت کچھ کچھ امیر خسرو کی یاد دلاتی ہے لیکن افسوس تلوّن مزاجی کے باعث کسی فن میں کمال کو نہ پہونچے۔ لطیفہ گوئی، شوخی اور ظرافت میں سوداؔ سے بھی آگے بڑھ گئے۔ غزل میں طرارے بھرتے ہیں۔ زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ قدرتِ کلام ضرب المثل ہے۔ ایک دیوان بے نقط لکھ ڈالا۔ سیکڑوں پہیلیاں، چیستاں، شعبدے نظم کر ڈالے۔

سید انشاؔ کا ایک نمایاں کارنامہ "دریائے لطافت" ہے جو قواعد اردو۔

محاورات اور بول چال پر اردو زبان کی پہلی محققانہ تصنیف ہے۔ اس کا آخری جزو عروض قافیہ پر ہے جو مرزا قتیل کی تصنیف ہے۔ نثر میں رانی کیتکی کی کہانی لکھی جس کو ہندی زبان کی تصنیف کہنا چاہئے کیونکہ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ بالکل استعمال نہیں کئے ہیں۔

انشا اور رنگین نے مل کر ریختی ایجاد کی جس میں عورتوں کی بول چال میں اشعار لکھے ہیں۔ ریختی کا کلام فنِ شاعری کے لحاظ سے پست ہے لیکن مستورات کے مخصوص محاورات کا خزانہ ہونے کی حیثیت سے لسانیات میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔

سید انشا اُن طباع لوگوں میں تھے جن کا ذہن کہیں ٹھہرتا نہیں شاید اسی لئے ان کے یہاں جذبات کم نظر آتے ہیں۔

پَرتو سے چاندنی کے، ہے صحنِ باغ ٹھنڈا
پھولوں کی سیج پر آ، کر دے چراغ ٹھنڈا

شفقت سے ہاتھ تو دھر ٹک دل پہ پھیرتا ہو
یہ آگ سا دہکتا، سینہ کا داغ ٹھنڈا

مے کی صراحی ایسی لا برف میں لگا کر
جس کے دھوئیں سے ہووے ساقی دماغ ٹھنڈا

نخنیس جس دنی کی ہے جوششِ چشم یار و
ہم نے مُدام پایا اُس کا اُجاغ ٹھنڈا

ہیں ایک شخص لاتے خس کی شراب انتشار
دھو دھا گلاب سے تو کر رکھ ایاغ ٹھنڈا

مجھے رونا آتا ہے شمعِ سحر پر — کہ بیچاری اب مستعد ہے سفر پر
کہاں تک کروں میں زمانہ کا شکوہ — ق — مصیبت ہے یوں تو سب اہلِ ہُنر پر
خصوصاً وہ جو وضعداری[ن] پہ ہیں یاں — برستا ہے افلاس ہی ان کے گھر پر

ن : وضعداروں میں ہیں یاں

نرگس نے پھر نہ دیکھا جو آنکھ اُٹھا چمن میں
کیا جانے کس نے کس سے کیا کر لیا چمن میں
کچھ اداس سی گلوں پر کیوں پڑ گئی یکایک
دیکھو تو کن نے کھولے بندِ قبا چمن میں
بجلی نہیں چمکتی نے ابر ہے یہ تجھ بن
پھرتی ہے آگ اُڑاتی کالی بلا چمن میں

لہرا دیا صبا نے جو کل سبزہ زار کو
وو ہیں گھٹا نے گھیر لیا چشمہ سار کو
جوش و خروشِ رعد نے وُہ دھوم دھام کی
ہرگز کوئی کسی کی نہ پہونچا پکار کو
بجلی تڑپ تڑپ کے دکھانے لگی چمک
رونق ہوئی دوچند ہر اک برگ و بار کو
کچھ لگ گئے ابرِ سپید و سیاہ و سرخ
مستانہ جھوم جھوم چلے کوہسار کو
شادابیِ ہوا نے یہ چاہا کہ کیجئے
محبوس کو چۂ رگِ گُل میں بہار کو

اُڑنے لگیں ملار کی تانیں فلک تلک ساز ندے چھیڑنے لگے بین و ستار کو
گویا ترانہ سنجیِ مطرب سے حال تھا اشجارِ گلستاں کی ہر اک شاخسار کو
ہم مشرب اپنے چند جواں تھے سو نہر پر تشریف لے گئے بطِ مے کے شکار کو
ساقی نے جام بادۂ گلفام دے مجھے کہنے لگا ہوا ہو نشہ کے خمار کو
القصہ پھر تو بیچ میں لاکر ملا دیا زور آورِ بہار نے انشا سے یار کو
بولی یہ عندلیب کہ باقی نہ چھوڑیو ایسے سمیں میں خواہشِ بوس و کنار کو

لو فقیروں کی دعا ہر طرح آباد رہو خوش رہو موجیں کرو تازہ رہو شاد رہو
ایرے غیرے وہ جو ہوں شوق سی چپٹ کر نہیں لڈائیا پر خدا والوں کی کرتے ہوئے امداد رہو
دید اُس کی ہی کرو جس نے بنایا سب کو نہ کہ ہر لحظہ فدائے گل و شمشاد رہو
چمنِ امن و اماں کی ہو تمہیں سیر نصیب سائیں اللہ سدا بر سرِ ارشاد رہو
عیش و عشرت کرو ہر وقت تم انشاء اللہ حسن چمکائے پھرو سب میں پریزاد رہو

طپشِ دل ہی سے ہم بل کے گلے بیٹھے ہیں
چھیڑ مت شعلۂ گُل بسکہ جلے بیٹھے ہیں

آہ کی دُھونی لگا در پہ ترے خاک نشیں
راکھ جوگی کی طرح منہ پہ ملے بیٹھے ہیں

سردی و گرمی و برسات جو ہو یا قسمت
تیری دیوار کے ہم سایہ تلے بیٹھے ہیں

سیرِ گلشن کی نہ تکلیف ہمیں دے انشا
کُنجِ عزلت ہی میں ہم اپنے بھلے بیٹھے ہیں

کمر باندھے ہوئے چلنے کو، یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری، راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر ^ن^
غرض کچھ اور دھن میں، اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

ن - خیال ان کا پرے ہے عرشِ اعظم سے کہیں ساقی

بسانِ نقشِ پائے رہرواں، کُوئے تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنا حال ہے، اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار، بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمّل، آہ، ننگ و نام کیا شے ہے
میاں، رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے، اس دور میں یارو
جہاں پوچھو، یہی کہتے ہیں، ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے، جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

جھڑکی سہی، ادا سہی چینِ جبیں سہی
یہ سب سہی، پر ایک نہیں کی، نہیں سہی

ن - یہ اپنا حال ہے افتادگی سے ان دنوں، پہروں

مرنا مرا جو چاہے، تو لگ جا گلے سے ٹک — اٹکا ہے دم مرا یہ دمِ واپسیں سہی

گر نازنیں کے کہنے سے، مانا برا ہو کچھ — میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

آگے بڑھے جو جاتے ہو، کیوں، کون ہے یہاں — جو بات ہم کو کہنی ہے تم سے، نہیں سہی

منظور دوستی جو تمہیں ہے ہر ایک سے

اچھا، تو کیا مضائقہ انشا سے کیں سہی

یہ نہیں برق اک فرنگی ہے — رعد و باراں، قشون جنگی ہے

کوئی دنیا سے کیا بھلا مانگے — وہ تو بیچاری آپ ننگی ہے

واہ دلّی کی مسجدِ جامع — جس میں براق فرش سنگی ہے

حوصلہ ہے فراخ رندوں کا — خرچ کی پر بہت سی تنگی ہے

لگ گئے عیب سارے اسکے ساتھ — یوں کہا جس کو مرد بنگی ہے

ڈر وحشت کی دھوم دھام سے تم — وہ تو اک دیونی دبنگی ہے

ن: کو ٥ ن: دیکھو ؛ ن: نہیں

جوگی جی صاحب آپکی بھی واہ　　دھرم مورت عجب ڈھنگی ہے

آپ ہی آپ ہے پکار اُٹھتا　　دل بھی جیسے گھڑی فرنگی ہے

چشمِ بد دُور شیخ جی صاحب　　کیا اِزار آپ کی اُٹنگی ہے

شیخ سعدیِّ وقت ہے انشا

تو ابُو بکر سعدِ زنگی ہے

کل ایک گھر میں خوب سے چھوٹے بڑے لڑے

ہاتھوں سے ہاتھ، اور کڑوں سے کڑے لڑے

چھلنی سے چھاجھ، چھاجھ سے چھلنی اُلجھ گئی

مٹکوں سے مٹکے ٹوٹے، گھڑوں سے گھڑے لڑے

لڑکوں سے لڑکے چمٹے، جوانوں سے جب جوان

بڈھوں سے بڈھے کڑ بڑوں سے کڑ بڑے لڑے

چیونٹوں سے چیونٹے گتھ پڑے چیونٹیوں سی چیونٹیاں
بیٹھوں سے بیٹھے لپٹے، کھڑوں سے کھڑے لڑے

حقّوں سے حقّے، چلموں سے چلمیں بھی ٹوٹیاں
نیچوں سے نیچے، گڑگڑوں سے گڑگڑے لڑے

جب تُل گئی لڑائی ترازو کی تول میں
بانٹوں سے بانٹ ٹوٹے، دَھڑوں سے دھڑے لڑے

اَنشا یہ دیدے اپنے بھی، اس دُھوم دھام میں
دیدوں سے ایک شخص کے، ہو کر کڑے لڑے

میاں، چشمِ جادو پہ، اتنا گھمنڈ　　خط و خال و گیسو پہ، اتنا گھمنڈ
اجی، سر اٹھا کر ادھر دیکھنا　　اسی چشم و ابرو پہ، اتنا گھمنڈ
نسیم گُل اس زلف میں ہو، تو آ　　نہ کر اپنی خوشبو پہ، اتنا گھمنڈ

وُہ کر پنجہ انشا سے بولے کہ واہ
اسی زورِ بازو پہ، اتنا گھمنڈ

غنچوں کو رَوند، گل کو مَسَل اور صبا کو چھیڑ
لیکن نہ اُس کے عقدۂ بندِ قبا کو چھیڑ

کیا گا رہا ہے اپنی اُپَج اے حدی سرا
جس سے کہ قیس لوٹ ہوا اُس صدا کو چھیڑ

اے ہمنشیں، یہ موسمِ ہولی ہے، اِن دِنوں
منظور ہے جو سیر، تو اُس خُوش ادا کو چھیڑ

اک بوالہوس نے، اُن کی جو آنا سے کچھ کہا
رستہ میں اپنے توسنِ حرص و ہوا کو چھیڑ

بُرقع اُلٹ کے منہ سے وُہ کہنے لگی چچے!
بیٹا، کسی جوان سے صاحبِ ادا کو چھیڑ

لیجا کے چُپکے چپکے دوشالہ کے نیچے ہاتھ
ناخن گڑو کے، چٹکی لے، انگشتِ پا کو چھیڑ

انشا جو ہونی ہووے سو ہو، دل کہی ہی یوں
تا چند ضبط، آج تو اُس دل ربا کو چھیڑ

پرچھائیں اپنی چال کی ٹک منہ کو موڑ دیکھ — گردن کی یہ لچک، یہ کمر کی مروڑ، دیکھ

پیکانِ تیر آہ ہے آلودہ زہر سے — باور نہ ہو تجھے، تو مرے دل کو توڑ، دیکھ

جوڑی جو اُن نے تجھ سے تو توڑی رقیب سے — اِنشا تو اپنے یار کے، یہ توڑ جوڑ، دیکھ

بندگی ہم نے تو جی سے اپنے ٹھانی آپ کی
بندہ پرور، خیر آ گے قدر دانی آپ کی

لیکے میں اوڑھوں بچھاؤں، یا لپیٹوں کیا کروں
روکھی پھیکی، ایسی سوکھی، مہربانی آپ کی

سیّد اِنشا صاحب آتا رحم ہے مجھ کو کہ ہائے
کٹتی ہے کس درد و غم میں نوجوانی آپ کی

لب پہ آئی ہوئی یہ جان پھرے — یار گر اس طرف کو آن پھرے

ن ۔ بندگی اپنے تو جی سے ہم نے ٹھانی آپ کی

چین کیا ہو ہمیں، جب آٹھ پہر — اپنی آنکھوں میں، وہ جوان پھرے

رُوٹھ کر اُٹھ چلے تھے انشا سے
بارے، پھر ہو کے مہربان پھرے

یہ پیاس اپنی، بُجھے برف ہی، نہ شورے سے — بُجھے، تو نرگسِ ساقی کے آبخورے سے
نشہ میں کیوں نہ کروں غش، دکھا دیے تم نے — وہ دونوں دیدے، مےِ ناب کے کٹورے سے
بلا سے جام نہ ہوئے، نہ ہو کہ یاں ہم لوگ — چڑھا گئے ہیں گھڑوں کے گھڑے سکورے سے
نہیں جو رات کو جاگے، تو کیوں اُبھر آئے — یہ لال لال، کچھ آنکھوں میں، ڈورے ڈورے سے

صاحب کے ہرزہ پن سے، ہر ایک کو[ن] گلہ ہے — میں جو نباہتا ہوں، میرا ہی حوصلہ ہے
بارِ گراں[ل] اٹھائیں، کس واسطے عزیزو — ہستی سے کچھ عدم تک، تھوڑا ہی فاصلہ ہے

ل: ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ — دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا — سودا
ن: کے

لگی ہے مینھ کی جھڑی، باغ میں چلو جھولیں کہ جھولنے کا مزہ بھی اسی بہار میں ہے
پھوہار مینھ کی خوش آیند ہے بہت، اس وقت شراب پینے کا موقع اسی پھوہار میں ہے

حیف ایّام جوانی کے چلے جاتے ہیں
ہر گھڑی دن کی طرح ہم تو ڈھلے جاتے ہیں

ریختی

چڑھ کے کوٹھے دھوپ میں تم تو اڑاتی ہو پتنگ
اے دوگانہ چاندنی میں یاں اُڑا جاتا ہے رنگ
پگھلی چاندی کی طرح سے ہے تھلکتی چاندنی
آج کوٹھے پر لگا دو میرے سونے کا پلنگ
بات آتو جی کی کچھ ہرگز نہیں تُو مانتی
سچ تو یہ ہے، بیگما تو نے برے سیکھے ہیں ڈھنگ

کیا بھلی لگتی ہے اٹکھیلی کسی کی، وَاہ وَا

اور وُہ نام خدا اُٹھتی جوانی کی اُمنگ

جان صدقے اُس پری کے جن نے انشا سی کہا

اب ترے ہاتھوں سی یہ بندی بہت آئی ہے تنگ

انتخاب از دیوان بے نقط

سلسلہ گر کلام کا وا ہو　　سامعِ دردِ دل کو سودا ہو

دل کو سو طرح کا سُرور ہو آہ　　وُہ دل آرام گر ہمارا ہو

کر موحد دعا کہ انشا کا

کار ہر دو سرا اِلٰہا ہو

ملا رگا کہ سر کوہسار لال ہوا　　عروسِ لالہ کو طاؤس وار حال ہوا

ن : بتنگ

ہوا کو عطر لگا اور گُل کھلا ہر گاہ　　　وُہ ماہ مالکِ عمرِ دہ و دو سال ہُوا

ملا اساسِ عُلوم و کمال سو ہم کو　　　حوالہ امرا گو کہ ملک و مال ہوا

رہا معاملہ ہمراہ عکس اس حد کو　　　کہ لال لال وُہ کل گورا گورا گال ہوا

ملا وُہ ماہ کہ الحمدُ للہ اوا آنشا

کہ دُور لاکھ طرح عالم ملال ہوا

لکھنؤ کے ابتدائی دور کے اساتذہ

دیوانہ: رائے سرب سکھ، لکھنؤ کے اوّلین اساتذہ میں سے تھے۔ ان کا سلسلۂ تلامذہ جعفر علی حسرت اور جرأت کے ذریعہ آج تک چلا آرہا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کے حالات اور دیوان دستیاب نہیں۔ حکیم قدرت اللہ قاسم مجموعۂ نغز میں لکھتے ہیں:۔

"دیوانہ تخلص ہندو نژادے است۔ سرب سکھ نام۔ وے از شعرائے مشرق است۔ در بلدۂ لکھنؤ یک چند علم استادی افراز د۔ وکمتر کسے بود کہ نسبتِ تلمذ بوے نداشت۔ جعفر علی حسرت کہ استاد شیخ قلندر بخش جرأت است نسبت تلمذ

بوے دارد۔ وکمتر کسے از سکنۂ آں دیار وے را اُستاد نہ پندارد۔۔۔۔"

کلام کا نمونہ یہ ہے:-

رُباعی

وُہ لوگ کہاں کہ یار باشی کیجے
وُہ وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے
اک گوشہ میں اپنے بیٹھ ہو کر تنہا
اب ناخن غم سے غم تراشی کیجے

غزل

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وُہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اُسے پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ وُ پرفن تھے و لے
گرمیٔ بزم کہاں اُس بُتِ عیّار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر

جان پر آبنی ہمدم، مری خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے

کیونکہ دیوانہ بھلا رہئے اب اُس یار بغیر

حسرت : جرأت کے استاد مرزا جعفر علی حسرت کا دیوان دستیاب نہ ہو سکا اس لیئے ان کی غزلوں کا انتخاب ہم پیش نہ کر سکے۔ کلام کا نمونہ حاضر ہے۔

خدا حافظ ہے، کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا

تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا

بہاریں ہم کو بھولیں، یاد ہے اتنا کہ گلشن میں

گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

نہیں معلوم کیا تھا جو سحر تک شمع رو یا کی

کچھ اپنا حال پروانہ سُنانے شام آیا تھا

کسے منظور تھا، یوں تلخ کیجے زندگانی کو
وَلے کیا کیجیے حسرت، بلائے ناگہانی کو

ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے
لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

تمہیں غیروں سے کم فرصت ہم اپنے غم سے کم خالی ^ن^
چلو بس ہو چکا مِلنا، نہ تم خالی نہ ہم خالی

یہ بھی اک ستم تھا کہ خواب ہیں مجھے اپنی شکل دکھا گئے
کبھی نیند برسوں نیں آئی تھی، سو وہ اس طرح سی جگا گئے

پَروانہ: کاکاجی، سَرب سُکھ دِیوانہ کے شاگرد اور جعفر علی حسرت کے ہمعصر تھے۔ افسوس ہے کہ اِن کے حالات دستیاب نہیں۔ کلام صاف اور سادہ ہے ~

ن تمہیں غیروں سے کب فرصت، ہم اپنے غم سے کب خالی

ضعف ہے غش ہے، ناتوانی ہے — بِن ترے، موت زندگانی ہے
کون مدفون ہے چمن میں صبا — جس کی تربت پہ گلفشانی ہے
پوچھتے اب ہو مرغِ دِل کا حال — کب سے وُہ جنت آشیانی ہے
آپ نے رات چھُپ کے پی ہے شراب — رنگ چہرے کا ارغوانی ہے

آہ پروانہ شمع ہے لیکن
زور اس میں شرر فشانی ہے

کیا کہیں ہجر یار نے مارا — وصل کے انتظار نے مارا
چین دیتا نہیں کسی پہلو — اس دلِ بیقرار نے مارا
ہیں جو آسودگانِ خاک انہیں — گردشِ روزگار نے مارا
غرق بحرِ فنا کیا آخر — دیدۂ اشکبار نے مارا
شمع ساں گھُل گیا میں پروانہ — اس دلِ بیقرار نے مارا

حیراں : میر حیدر علی، رائے سرب سکھ دیوانہ کے شاگرد تھے ؎

گر یہی وضع ہے، اور ہیں یہی ہیہات نصیب
تو ہمیں ہو چکی بس اُس سے ملاقات نصیب

صبح ہر روز اِسی غم میں ہمیں ہوتی ہے شام
آہ، جاگیں گے مرے کون سی اب رات نصیب

کچھ ہمیں شکوہ نہیں جَور سے تیرے ہرگز
ہم ہمیشہ سے ہیں اے جان! کچھ آفات نصیب

مسجدوں میں پھرے نِت سبحہ پھراتے حیراں
شیخ جی پر نہ ہوئی تم کو کرامات نصیب

مائل : مرزا محمد یار بیگ، شاگرد جرأت ؎

اختر سے تھے گر موتی اُس کان کے بالے کے
اک چاند بھی جھمکے تھا، جھرمٹ میں دوشالے کے

فانوس میں کب دیکھا یوں شمع کے شعلہ کو
جھمکے ہے بدن اُس کا جوں کرتہ میں والے کے
وُہ زُلف جو ڈس جاوے تو خاک جئے کوئی
بچتے ہیں کہیں ناگ کاٹے ہوئے کالے کے

افسوس (۱۷۳۵ء - ۱۸۰۹ء) میر شیر علی، میر حیدر علی حیران کے شاگرد تھے۔ شعر و شاعری سے زیادہ اپنی نثر نگاری کے لئے مشہور ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج میں ملازم رہے۔ تصانیف میں اردو ترجمہ گلستانِ سعدی اور آرائشِ محفل مشہور ہیں۔

سمندِ گرم جو یاں اُس سوار کا پہونچا — غبار تا فلک اس خاکسار کا پہونچا
ہے یاں تلک تو نزاکت، گلوں کے گجرے سے — لچکنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہونچا

قفس سے چھٹنے کی امید ہی نہیں افسوس
حصول کیا ہے، جو مژدہ بہار کا پہونچا

تجلّی: میاں حاجی۔ میر تقی میر کے بھتیجے اور شاگرد تھے ؎

طرب کا رنگ رُخِ گل پہ آشکار آیا
کلی سی کھل گئی جو نہی وہ گلعذار آیا

تڑپ کے جان نکل جائیگی ابھی صیّاد
نہ کہیو باغ میں پھر موسمِ بہار آیا

ملا میں خاک میں مر مر کے آہ، پر تو بھی
نہ بیقراریٔ دل کے تئیں قرار آیا

یہ شوق دیکھو، پسِ مرگ بھی تجلّی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

اسد: میر امانی۔ سودا کے شاگرد تھے ؎

پی کر شراب دُردِ تہِ جام دے گیا
وُہ شوخ ہم کو بوسہ بہ پیغام دے گیا

آیا جو میکشی کو چمن میں وُہ بادہ نوش
ہر ایک گل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا

کھانے کو غم ہے پینے کو خوں، دیکھنے کو داغ
سب عشق کا وُہ ہم کو سرانجام دے گیا

کل لڑ گیا کہ اور یہ عاشق ہے تو اسد
آیا ہے جب وُہ یاں تو اک الزام دے گیا

اَلَم: صاحب میر۔ خواجہ میر دَرد کے صاحبزادے تھے ؎

دھمکاتے ہیں بس مجھکو فقط آپ اکڑ کر — بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے رگڑ کر

ہنگام فغاں تھا خس، و پنبہ قفس و دام — تارِ رگِ گل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر

جب نامِ خدا دور سے وُہ جلوہ نما ہو — مرجائیں صفوں کی صفیں حیرت سے بچھڑ کر

آجاتا ہے دکھ درد بھلانے کو اَلَم یاں
کیا اس سے مزہ تم ہو اُٹھاتے بھلا لڑ کر

مُحِبّ: شیخ ولی اللہ، شاگرد سَودا ؎

اُس بُت نے گلابی جو اُٹھا منہ سے لگائی — شیشے میں عجب آن سے جھمکی تھی خدائی

عالم ہیں نشّے کے شبِ مہتاب میں تیرے — خورشید سے مکھڑے نے طلسمات دکھائی

واللہ! ہمیں عشق کی سب بھولی ہوئی چال — کافر تری رفتار نے اب یاد دلائی

ہم جھوٹ کہیں تو نہ ہو دیدار خدا کا — ہے روزِ قیامت تری اک شب کی جدائی

عاشق کو مُحبّ سلطنتِ ہر دو جہاں ہے
گر یار کے کوچہ کی میسّر ہو گدائی

رنگین :۔ سعادت یار خاں، سرہند میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دربارِ دہلی کے منصب داروں میں تھے۔ رنگین اور اِن کے دوست انشا نے مِل کر ریختی ایجاد کی۔ عورتوں کی زبانی شاعری محض تفریحِ طبع کی ایک چیز تھی لیکن اِن صاحب کمالوں نے اُس میں طرح طرح کی شوخیاں اور دلچسپیاں پیدا کیں۔

دیگر تصنیفات میں چند مثنویاں، ایک تذکرۂ شعرا بنام "مجالسِ رنگین" اور منظوم سبق آموز کہانیوں کا ایک مجموعہ بنام "حکایاتِ رنگین" مشہور ہیں۔

نمونہ کلام ریختی :

ہے اجی میری دوگانا کی سجاوٹ خاصی	چمپئی رنگ غضب، اس پہ کھچاوٹ خاصی
سر کی تعویذ ستم، اور رفتح پیچ عجیب	بال مہکے ہوئے، چوٹی کی گندھاوٹ خاصی
سب سے گفتار جدی، سب سے نرالی نک سک	دانت تصویر ہیں، ہنسی کی جماوٹ خاصی

شہر آشوب دھڑی، تس پہ لکھوٹا کافر ۔۔۔ مسی جو چھوٹا ہے تو ہے مُنھ کی بھلاوٹ خاصی

گر جگت بولے، تو پرکالۂ آتش ہو زبان ۔۔۔ اور جو رک جائے تو رُکنے میں رکاوٹ خاصی

قطع چولی کی عجب، گھیر ہے دامن کا طلسم ۔۔۔ آستیں چُست بہت، اور پھباوٹ خاصی

ناز زیبندہ، حیا آفت، و عشوہ جادو ۔۔۔ غمزہ وہ ظلم، ادا نور، رکھاوٹ خاصی

کیوں نہ ایسے سے پھنسے دِل، اجی انصاف کرو ۔۔۔ گفتگو سحر، کمر خوب، لگاوٹ خاصی

پاؤں میں کفش بھبھوکا وُہ مغرق نادر ۔۔۔ سرو قد اور رہے زانو کی ڈھلاوٹ خاصی

سب سے سب بات جدی، سب سے انوکھی رفتار ۔۔۔ سب سے پوشاک الگ، سب سے کھچاوٹ خاصی

اس کا اظہار کروں تجھ سے میں کیا کیا رنگیں
دست و پا تحفہ ہیں، مہندی کی رچاوٹ خاصی

باب چہارم- ایک آزادروش شاعر

نظیر

(۱۷۳۵ء تا ۱۸۳۰ء)

ولی محمد- نظیر اکبرآبادی، شہر دہلی میں پیدا ہوئے لیکن عمر کا زیادہ حصہ آگرہ میں گزارا اور وہیں شہرت حاصل کی۔ لڑکوں کو پڑھانے کا پیشہ اختیار کیا۔ اور قلندرانہ انداز میں قناعت کے ساتھ عمر گذاردی۔ نظیر کے کلام میں مضامین اور انداز بیان دونوں کے لحاظ سے، عجیب و غریب پستیاں اور بلندیاں نظر آتی ہیں۔ اخلاقی اور صوفیانہ مضامین اس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ ان کی بہت سی نظمیں زبان زد

خلائق ہیں۔

عاشقانہ اشعار اکثر شوخی اور شرارت سے بھرے ہوئے ہیں۔ غالباً اپنی افتادِ طبیعت اور بے پروائی کی وجہ سے، اِن کے اشعار میں زبان اور محاوروں کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے پرانے تذکرہ نویسوں نے ان کو وُہ جگہ نہ دی جس کے جدید نقطۂ نظر سے بہ مستحق تھے۔ ان کا کلام اپنے زمانہ کے عوام کی روزمرّہ کی زندگی کا آئینہ ہے۔ اور ان کا فلسفۂ حیات اصلی تجربات زندگی پر مبنی ہے۔

نظیر غزل کے میدان کے مرد نہ تھے۔ اس لئے اس انتخاب میں افسوس ہے کہ ہم ان کا اصلی رنگ نہیں پیش کر سکتے جو اِن کے مسدّس، قطعات اور مثنویوں میں خوب نکھرتا ہے۔

وُہ چاندنی میں جو ٹک سیر کو نکلتے ہیں ۔۔۔ تو مہ کے طشت میں گھی کے چراغ جلتے ہیں

پڑے ہوس ہی ہوس میں ہمیشہ گلتے ہیں ۔۔۔ ہمارے دیکھئے ارمان کب نکلتے ہیں

ہجومِ آہ ہے آنکھوں سے اشک ڈھلتے ہیں
بھرے ہیں چاؤ جو دل میں سو یوں نکلتے ہیں

چراغِ صبح یہ کہتا ہے آفتاب کو دیکھ
یہ بزم تم کو مبارک ہو، ہم تو چلتے ہیں

برنگِ اشک کبھی گر کے ہم نہ سنبھلے آہ
یہی کہا کئے جی میں، کہ اب سنبھلتے ہیں

نکالتا ہے ہمیں پھر وہ اپنے کوچے سے
ابھی تو نکلے نہیں ہیں، پر اب نکلتے ہیں

ہوا نحیف بھی یاں تک کہ حضرتِ مجنوں ق
یہ مجھ سے کہتے ہیں، اور ہاتھ اپنے ملتے ہیں

کوئی تو پگڑی بدلتا ہے اور سے لیکن
میاں نظیرؔ، ہم اب تم سے تن بدلتے ہیں

نہ سرخی غنچۂ گل میں، ترے دہن کی سی
نہ یاسمن میں صفائی، ترے بدن کی سی

میں کیوں نہ پھولوں، کہ اُس گلبدن کے آنے سے
بہار آج مرے گھر میں ہے چمن کی سی

گلوں کے رنگ کو کیا دیکھتے ہو، اے خوباں
یہ رنگتیں ہیں تمہارے ہی پیرہن کی سی

جو دل تھا وصل میں آباد، تیرے ہجر میں آہ
بنی ہے شکل اب اُس کی اجاڑ بن کی سی

تو اپنے تن کو نہ دے نسترن سے اب تشبیہ
بھلا، تو دیکھ یہ نرمی ہے تیرے تن کی سی

نہیں ہوا ہیں یہ بو، نافۂ ختن کی سی
لپٹ ہے یہ تو کسی زلفِ پُرشکن کی سی

میں ہنس کے اسلیے مُنھ چومتا ہوں غنچے کا
کہ کچھ نشانی ہے اس میں ترے دہن کی سی

ہزار تن کے چلیں، بانکے خوبرو، لیکن
کسی میں آن نہیں، ترے بانکپن کی سی

کہاں تو اور کہاں اس پری کا وصل نظیر
میاں تو چھوڑ یہ باتیں دِوانے پن کی سی

ہنسے، روئے، پھرے، رُسوا ہوئے، جاگے، بندھے، چھوٹے
غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبّت کے مزے لوٹے

کلیجے میں پھپھولے، دل میں داغ، اور گل ہیں ہاتھوں پر
کِھلے ہیں دیکھئے، ہم میں بھی، یہ اُلفت کے گُل بوٹے

تفاوت کچھ نہیں گلچیں میں اور بیدرد خوباں میں
جو اِس کے ہاتھ گل ٹوٹے، تو اُن کے ہاتھ دِل ٹوٹے

ہزاروں گالیاں دیں، پھر ذرا ہنس کر ادھر دیکھا
بھلا اتنی تسلّی سے پپھولے دل کے کب ٹوٹے

کُھلتے ہو مجھے تم، میں یہ مانگوں ہوں دعا دل میں
کوئی دلبر مرے آگے، تمہیں بھی خوب سا کوٹے

ہماری، روح تو پھرتی ہے معشوقوں کی گلیوں میں
نظیر اب ہم تو مر کر بھی نہ اس جنجال سے چھوٹے

کیا کہیں، دنیا میں، ہم انسان یا حیوان تھے
خاک تھے کیا تھے، غرض اک آن کے مہمان تھے

کر رہے تھے اپنا قبضہ، غیر کی املاک پر
غور سے دیکھا تو ہم بھی سخت بے ایمان تھے

اور کی چیزیں دبا رکھنا، بڑی سمجھی تھی عقل
چھین لیں، جب اس نے یہ جانا کہ ہم نادان تھے

ایک دن اک اُستخواں او پر پڑا میرا جو پاؤں
کیا کہوں اُس دم مجھے غفلت میں کیا کیا دھیان تھے

پاؤں پڑتے ہی غرض اس استخواں نے آہ کی
اور کہا غافل کبھی تو ہم بھی صاحب جان تھے

دست و پا، زانو، سر و گردن، شکم، پشت و کمر
دیکھنے کو آنکھیں اور سننے کی خاطر کان تھے

ابرو و بینی، جبیں، نقش و نگار و خال و خط
لعل و مروارید سے بہتر لب و دندان تھے

رات کو سونے کو کیا کیا نرم و نازک تھے پلنگ
بیٹھنے کو دن کے کیا کیا کوٹھے اور دالان تھے

کھل رہا تھا روبرو جنّت کے گلشن کا چمن
نازنیں محبوب گویا حور اور غلمان تھے

لگ رہا تھا دل، کئی چنچل پریزادوں کے ساتھ
کچھ کسی سے عہد تھے، اور کچھ کہیں پیمان تھے

گلبدن اور گلعذاروں کے کنار و بوس سے
کچھ نکالی تھی ہوس، کچھ اور بھی ارمان تھے

مچ رہے تھے چہچہے اور اڑ رہے تھے قہقہے
ساقی و ساغر، صراحی، پھول عطردان تھے

ایک ہی چکر دیا ایسا اجل نے آن کر
جو نہ ہم تھے، اور نہ وہ سب عیش کی سامان تھے

ایسی بیدردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ، اے نظیر
او میاں تیری طرح ہم بھی کبھی انسان تھے

دور سے آئے تھے ساقی، سن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس! پیمانے کو ہم

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم

ہم کو پھنسنا تھا قفس میں، کیا گلہ صیاد کا
بس ترستے ہی رہے ہیں آب اور دانے کو ہم

باغ میں لگتا نہیں، صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتا دے اے نظیرؔ
تاکہ شادی مرگ سمجھیں، ایسے مر جانے کو ہم

جُدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو
یہ داغ وُہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

جدا جو ہم کو کرے اس صنم کے کوچے سے
الٰہی راہ میں ایسا کوئی رقیب نہ ہو

تاب اُس کے دیکھنے کی نہ لائے، چلے گئے
کیا کیا بڑے جوان تھے آئے، چلے گئے

دارا رہا، نہ جم، نہ سکندر سا بادشاہ
تختِ زمیں پہ سیکڑوں آئے، چلے گئے

آدمؑ رہا، نہ کوئی پیمبر رہا یہاں
وُہ بھی اسی زمیں میں سمائے چلے گئے

باب پنجم، لکھنؤ کی شاعری کا عروج

(انیسویں صدی کا آغاز)

انیسویں صدی تک اردو شاعری کی تعمیر مکمّل ہو چکی تھی۔ اب زیب و زینت کا اہتمام ضروری تھا۔ دربارِ اودھ کے زیر سایہ لکھنؤ میں اس کام کے لئے حالات مناسب تھے۔ ناسخ نے زبان کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور نزاکتِ خیال کے ساتھ سادگیِ بیان کا ایسا انداز ایجاد کیا جس کو کوئی دوسرا اتنی خوبی سے نباہ نہ سکا۔ آتش نے صناعی کے ساتھ ساتھ حقیقی جذبات کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

آتش اور ناسخ طبیعتاً خود دار اور آزاد روش تھے۔ اس لئے دربار اور امراء سے علیحدہ رہے۔ البتہ زمانہ کے حالات کے زیر اثر اِن کے شاگردوں کے زمانہ میں اردو شاعری میں وہ بناوٹ اور تصنّع پیدا ہو گئے جس کے لئے وہ آج تک بدنام ہے۔ اپنے اپنے طرز میں دونوں اساتذہ نے غزل کی شاعری کو درجۂ کمال تک پہونچا دیا۔ اس زمانہ کو لکھنؤ کی شاعری کا زرّیں دور کہنا چاہیئے۔

ناسخ

۱۷۷۴ء تا ۱۸۳۸ء

شیخ امام بخش ناسخ۔ غالباً لاہور کے رہنے والے تھے۔ ابتدائے عمر میں لکھنؤ چلے آئے تھے اور کہتے ہیں علمائے فرنگی محل سے تعلیم حاصل کی۔

شیخ ناسخ نے اردو شاعری کو ایک فن کی حیثیت سے ترقّی دی۔ زبان کو صحیح اور بامحاورہ بنایا۔ نازک خیالی کو جذباتی شاعری پر ترجیح دی۔ یہ مخصوص طرز لکھنؤ کے مُوجد کہے جاتے ہیں۔ کلام میں لطف اور اثر کم ہے، لیکن قواعدِ زبان اور صحت کے لحاظ سے بےعیب ہے۔ اس لئے یہ صحیح معنوں میں استاد مانے جاتے ہیں۔ دہلی کے

شعرا غالب، مومن اور ذوق جن کے کلام کا طرز بالکل مختلف ہے وہ بھی ان کی استادی تسلیم کرتے تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں ان کا تتبع کرنے کی کوشش کی۔ غالب کے ابتدائی کلام کا رنگ دیکھتے ہوئے یہ روایت بعید از قیاس نہیں۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

شفق سمجھا ہے اس کو ایک عالم، وائے بیدردی
فلک پر گر بگولا جا لگا خاکِ شہیداں کا

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی آنکھوں میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جسکے داماں کا

کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا

مرا ویرانہ مثلِ آئینہ معمورِ حیرت ہے
یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشمِ حیراں کا

کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا
نہ الجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا بسمل
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

یہ نُور ہے روئے مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا

جو حلقہ ہے زلفِ عنبریں کا وہ ایک نافہ ہے مشکِ چیں کا

یہ اُس کی ہے ساعدوں کا عالم کہ جس نے دیکھے ہوا وہ بیدم

نیامِ تیغِ قضائے مبرم نقب ہے قاتل کی آستیں کا

یہ جوش پر یاں ہے اشک کا یم کہ ساتوں دریا ہیں قطرے سے کم

جسے کہ کہتے ہیں سب جہنّم شرر ہے اک آہِ آتشیں کا

بُرا ہو بدبخت عاشقی کا نہ دیں ہو برباد، یوں کسی کا

بنا ہے عشق بتاں میں ٹیکا، نشانِ سجدہ مری جبیں کا

طمع ہے انصاف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب بیاں سے

کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر رتبہ اس زمیں کا

دل میں پوشیدہ تپِ عشقِ بتاں رکھتے ہیں آگ ہم سنگ کے مانند نہاں رکھتے ہیں

مثل پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس
ہم فقط تم پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں

محفلِ یار میں کچھ بات نہ نکلی منھ سے
کہنے کو شمع کی مانند زباں رکھتے ہیں

ہو گیا زرد، پڑی جس پہ حسینوں کی نظر
یہ عجب گل ہیں کہ تاثیرِ خزاں رکھتے ہیں

ہے عوض ملکِ جہاں، ملکِ سخن اے ناسخؔ
گو نہیں حکم رواں، طبعِ رواں رکھتے ہیں

مجھکو اب ساقیِ گلفام سے کچھ کام نہیں
مے سے کچھ کام نہیں، جام سے کچھ کام نہیں

دل میں خوش آتی ہیں صحرا کی ببولیں پرخار
اب کسی سروِ گل اندام سے کچھ کام نہیں

اپنے آرام سے ہوں دشتِ جنوں میں تنہا
کسی محبوبِ دل آرام سے کچھ کام نہیں

خانہ برباد ہوں صحرا میں، بگولوں کی طرح
سقف و دیوار و در و بام سے کچھ کام نہیں

طائرِ روحِ رمیدہ کی طرح چھوٹا ہوں
اب تو صیّاد ترے دام سے کچھ کام نہیں

اتنی مدّت سے ہوں غربت میں وطن بھول گیا
مجھکو اب نامہ و پیغام سے کچھ کام نہیں

سب کی سب کیا ہیں شب قدر ہماری راتیں
کٹتی ہیں آنکھوں ہی میں ہجر کی ساری راتیں
ہائے کیا پیار سے سوئے تھے لپٹ کر ای جان
یاد ہر دم مجھے آتی ہیں وہ پیاری باتیں
جو گھڑی ہے نظر آتی ہے مجھے ایک پہاڑ
ہیں غضب فرقتِ محبوب کی بھاری راتیں
دن کے بدلے میں یہی آتی ہیں غم خواری کو
مجھ سے رکھتی ہیں بہت ہجر میں یاری راتیں
دن تو ناسخ کے بہ ہر حال گذر جاتے ہیں
پر جدائی میں بہت لاتی ہیں خواری راتیں

پیئیں نہ آبِ بقا بھی شراب کے بدلے　　شراب پیتے ہیں ہم بلکہ آب کے بدلے

کمالِ شوقِ مُلاقات اس نے لکھا ہے — چلوں میں آپ ہی قاصد جواب کے بدلے

شبِ فراق میں بیٹھوں اگر میں بستر پر — یقیں ہے موت ہی آجائے خواب کے بدلے

کب اس کے دیکھنے کی مثلِ آفتاب ہے تاب — شعاعِ حُسن ہے مُنھ پر نقاب کے بدلے

جو دوں ترے لبِ میگوں کو برگِ گُل سی مثال — کھنچے شراب گلوں سے گلاب کے بدلے

حصولِ علم سے کیا ہو جو ہے سو قسمت ہے — میں سرنوشت پڑھوں اب کتاب کے بدلے

شبِ وصال یہ کوتاہ تھی کہ بس سرِ شام — طلوعِ مہر ہوا ماہتاب کے بدلے

شرابِ ساقیٔ کوثر سے مست ہوں ناسخ
ثواب مجھکو ملے گا عذاب کے بدلے

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں — جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

دورروز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں — وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب — یاں اعتبار دوستیِ جسم و جاں نہیں

منعم کے شکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی تنہا برائے لذّتِ دنیا زباں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا
باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

اس ابر میں یار سے جدا ہوں بجلی کی طرح، تڑپ رہا ہوں
اُمّیدِ وصال اب کہاں ہے اُس گُل سے، بَرَنگِ بُو، جُدا ہوں
آئینۂ دل میں ہے ترا عکس دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں
ہے مہر و وفا سَراسَر اس میں
ناصح کیوں کر اسے نہ چاہوں

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد، پھولوں کی

اگرچہ آئی ہے برسات، پھول پھولے ہیں
ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم ملولوں کی
معاف ناسخ عاصی کو کیجیو، مولیٰ
تمہیں تو آئیں بخشو گے سب رسولوں کی

آتش

(۱۷۶۷ء تا ۱۸۴۷ء)

خواجہ حیدر علی آتش مصحفی کے شاگرد تھے۔ اصلی وطن دہلی تھا۔ والد لکھنؤ آ گئے تھے۔ آتش فقیرانہ طبیعت اور سپاہیانہ مزاج رکھتے تھے۔ شاعری میں بھی وہی رنگ ہے۔ دنیاوی عیش و آرام، جاہ و اقتدار ان کی نظر میں حقیر تھے۔ ہمیشہ تنگدستی سے بسر کی۔ کلام میں ناسخ سے مقابلہ کرتے ہوئے استادی اور صحت کم ہے لیکن شوخی، رنگینی اور گرمی بہت زیادہ ہے۔ اپنے زمانہ میں ان دونوں اساتذہ اور ان کے شاگردوں کے گروہوں میں اکثر سرِ مشاعرہ مقابلے رہتے تھے۔

آتش کا کلام آج بھی بڑے لطف سے پڑھا جاتا ہے۔ عاشقانہ، صوفیانہ اور اخلاقی مضامین نہایت خوبی اور برجستگی سے باندھے ہیں۔ مضامین اور طرزِ ادا دونوں کی سادگی کے باعث خصوصاً جدید مذاق کے لوگوں کے لئے، ان کا کلام پسندیدہ ہے۔ شاعری اور مصوری کی مشابہت پہلی مرتبہ آتش کی زبانی سننے میں آتی ہے۔

یہ شاعر ہیں الٰہی، یا مصور پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے، نرالی صورتیں، ایجاد کرتے ہیں

خاک ڈال آنکھوں میں میری قافلہ جاتا رہا ۔۔۔ توڑ کر، تارِ نگہ کا سلسلہ، جاتا رہا
کون سے دن ہاتھ میں آیا مرے دامانِ یار ۔۔۔ کب زمین و آسماں کا فاصلہ جاتا رہا
دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر ۔۔۔ دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا
جب اٹھایا پاؤں، آتش، مثلِ آوازِ جرس
کوسوں پیچھے چھوڑ کر، میں قافلہ جاتا رہا

فریبِ حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ، بُت سے برہمن بگڑا

قبائے گل کو پھاڑا، جب مرا گل پیرہن بگڑا
بن آئی کچھ نہ غنچہ سے، جو وہ غنچہ دہن بگڑا

تری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور، انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

تونگر تھا، بنی تھی جب تک اُس محبوبِ عالم سے
میں مفلس ہو گیا جس روز سے وہ سیم تن بگڑا

لگے منھ بھی چڑانے، دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجے دہن بگڑا

بناوٹ کیفِ مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش
لگا کر منھ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

خدا سر دے تو سودا دے، تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں، تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

خیالِ تن پرستی چھوڑ، فکرِ حق پرستی کر
نشاں رہتا نہیں ہے، نام رہ جاتا ہے انساں کا

شبِ مہتاب میں، مُنھ کھول کر وُہ شوخ سوتا ہے
ستارہ آجکل چمکا ہوا ہے ماہِ تاباں کا

تری زلفوں نے بل کھایا تو ہوتا ذرا سنبل کو لہرایا تو ہوتا
رُخِ بے داغ دکھلایا تو ہوتا گلِ لالہ کو شرمایا تو ہوتا
بجا لاتے اُسے آنکھوں سے ای دوست کبھی کچھ ہم سے فرمایا تو ہوتا
اکڑنا بھول جاتے، سرو و شمشاد یہ قد بوٹا سا دکھلایا تو ہوتا
کہے جاتے، وُہ سنتے یا نہ سنتے زباں تک حالِ دل آیا تو ہوتا
سمجھتا، یا نہ اے آتش سمجھتا
دلِ مضطر کو سمجھایا تو ہوتا

شبِ وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا

مبارک شبِ قدر سے بھی وُہ شب تھی
سحر تک، مہ و مشتری کا قِراں تھا

وُہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا

نکالے تھے دو چاند اس نے مقابل
وُہ شب، صبحِ جنّت کا جس پر گماں تھا

عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل
فَرحناک تھی روح، دل شادماں تھا

مشاہد جمالِ پری کی تھیں آنکھیں
مکانِ وصال اک طلسمی مکاں تھا

حقیقت دکھاتا تھا عشقِ مجازی
نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

غیرتِ مہر، رشکِ ماہ ہو تم
خوبصورت ہو، بادشاہ ہو تم

جس نے دیکھا، تمہیں وُہ مر ہی گیا
حُسن سے تیغِ بے پناہ ہو تم

کیونکر آنکھیں نہ ہم کو دکھلاؤ
کیسے خوش چشم، خوش نگاہ ہو تم

حسن ہیں آپ کے ہی شانِ خدا عشق بازوں کے سجدہ گاہ ہو تم

فوق ہے سارے خوش جمالوں پہ وہ ستارے جو ہیں، تو ماہ ہو تم

کیوں محبت بڑھائی تھی تم سے ہم گنہگار، بے گناہ ہو تم

ہے تمہارا خیال پیشِ نظر جس طرف جائیں سدِ راہ ہو تم

دونوں بندے اسی کے ہیں آتش
خواہ ہم اس میں ہوویں، خواہ ہو تم

خارِ مطلوب جو ہووے، تو گلستاں مانگوں بجلی گرنے کو جو جی چاہے، تو باراں مانگوں

شمع گل ہووے جو صبحِ شبِ ہجراں مانگوں اوس پڑنی بھی ہو موقوف، جو باراں مانگوں

خاک میں بھی جو ملوں ہیں، تو کسی صحرا میں تم سے مٹّی بھی نہ اے گبر و مسلماں مانگوں

پادشاہی سے فقیری کا ہے پایا بالا بوریا چھوڑ کے کیا تختِ سلیماں مانگوں

رنج سے عشق کے ہے راحتِ دنیا بدتر زخم خنداں ہوں، اگر میں گلِ خنداں مانگوں

ذے دیا کیجئے، سودائی تمہارا ہوں میاں سونگھنے کو جو کبھی، زلفِ پریشاں مانگوں

ملتی ہو مانگنے سے باغِ جہاں میں جو مُراد گل سے بلبل کے کفن کیلئے داماں مانگوں

کب سے در پر ترے سائل ہوں میں آتش کیطرح
وہ ملے مجھکو، جو کچھ اے شہِ خوباں مانگوں

نکلتی کس طرح ہے جانِ مضطر دیکھتے جاؤ ہمارے پاس سے جاؤ، تو پھر کر دیکھتے جاؤ

نسیمِ نوبہاری کی طرح آئے ہو گلشن میں تماشائے گل و سرو و صنوبر دیکھتے جاؤ

جدھر جاتے ہو ہر گھر سے یہی آواز آتی ہے مسیحا ہو تو، بیماروں کو دم بھر دیکھتے جاؤ

قدم انداز سے باہر ہوئے جاتے ہیں صاحب کے ستم رفتار میں کرتی ہے ٹھوکر دیکھتے جاؤ

روش مستانہ چلتے ہو، قدم مستانہ پڑتے ہیں خدا کے واسطے بہرِ پیمبر دیکھتے جاؤ

نہ پھیرو اس سے مُنہ آتش جو کچھ در پیش آجائے
دکھاتا ہے جو آنکھوں کو مقدر دیکھتے جاؤ

سر شمع ساں کٹائیے، پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو، ہمت نہ ہاریے

مقسوم کا جو ہے، سو وہ پہونچیگا آپ سے
پھیلائیے نہ ہاتھ، نہ دامن پساریے

طالب کو اپنے رکھتی ہے دنیا ذلیل و خوار
زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیاریے

برہم نہ ہو مزاج کسی وقت آپ کا
ابتر ہوئی ہیں زلفیں نہایت سنواریے

نرگس کو صدقہ کیجیے، بیمار چشم کے
زلفِ سیاہ پر تری سنبل کو واریے

تنہائی ہے، غریبی ہے، صحرا ہے، خار ہے
کون آشنائے حال ہے، کس کو پکاریے

تبدیل روز وصل سے فرقت کی شب ہوئی
آئی ہوئی بلا ٹلی، صدقہ اتاریے

نازک دلوں کو شرط ہے آتش خیالِ یار
شیشہ خدا جو دے، تو پری کو اتاریے

موت مانگوں، تو رہے آرزوِ خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں، تو دریا ملے پایاب مجھے

میری ایذا کے لئے مردے میں جان آتی ہے
کاٹنے دوڑتی ہے ماہیِ بے آب مجھے

دہنِ گرگ سے جیتا جو بچوں صحرا میں — ذبح کرنے کے لئے، مول لے قصاب مجھے

فُرقتِ یار میں، کرتی ہے قیامت برپا — روزِ محشر سے نہیں کم، شبِ مہتاب مجھے

نہیں بھولا ہے جنوں میں، وہ حواس اُڑ جانا — یاد ہے برہمیِ صحبتِ احباب مجھے

دل غنی چاہیے، گو ہوں میں فقیر اے آتش
شیر کی کھال ہی ہے قاقم و سنجاب مجھے

وہی چتون کی خونخواری، جو آگے تھی، سو اب بھی ہے
تری آنکھوں کی بیماری، جو آگے تھی، سو اب بھی ہے
وہی نشو و نمائے سبزہ ہے گورِ غریباں پر
ہوائے چرخِ زنگاری، جو آگے تھی، سو اب بھی ہے
تعلق ہے وہی تاحال، اُن زلفوں کے سودے سے
سلاسل کی گرفتاری، جو آگے تھی، سو اب بھی ہے

وہی سر کا پٹکنا ہے، وہی رونا ہے دِن بھر کا
وہی راتوں کی بیداری، جو آگے تھی، سو اب بھی ہے

رواجِ عشق کے آئیں، وہی ہیں کشورِ دل میں
رہ و رسمِ وفا جاری، جو آگے تھی، سو اب بھی ہے

نیازِ خادمانہ ہے وہی، فضلِ الٰہی سے
بتوں کی ناز برداری، جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی سودائے کاکل کا ہے عالم، جو کہ سابق تھا
بہ شب بیمار پر بھاری، جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی بازار گرمی ہے محبّت کی، ہنوز آتش
وُہ یوسف کی خریداری، جو آگے تھی، سو اب بھی ہے

برنگِ آئینہ، انساں کی قسمت ہو اگر سیدھی　　موافق ہو زمانہ، دوست دشمن کی نظر سیدھی

زمیں پر پاؤں رکھ کر، آسماں پر ناز کرتا ہے — مگر ٹھوکر سے، چرخِ پیر کی، ہو گی کمر سیدھی

سرِ مغرور کو، جمعیتِ دُنیا جُھکاتی ہے — نہیں دیکھی چمن میں ہم نے، شاخِ باروَر سیدھی

نہ پستی و بلندی ہے، نہ ایسے پھیر کے رستے — عدم کی راہ سب راہوں سے ہے اے بے خبر سیدھی

پس از مُردن بھی حسرت باقی رہتی ہے جوانی کی — لحد میں کرتے ہیں پیرانِ خم گشتہ کمر سیدھی

اثر کرتی نہیں تعلیم، تیرہ روزگاروں کو — ادھر ٹیڑھی ہوئی شانہ نے کی وہ زلف اُدھر سیدھی

غریب آزار کا انجام کار اچھا نہیں ہوتا — بس اب اے آہ چرخِ پیر پر، برچھی نہ کر سیدھی

جو مُنہ میں یار کی آتا ہے، بک جاتا ہے اے آتش
نہ اُلٹی ہی سمجھتا ہے، نہ وہ رشکِ قمر سیدھی

چلی ہے ایسی زمانہ میں کچھ ہوا اُلٹی — کہ سیدھی بات سمجھتے ہیں آشنا اُلٹی

بیانِ حالتِ دل پیشِ یار ہو نہ سکا — زباں کبھی نہ دمِ عرضِ مدّعا الٹی

کسی طرح سے نہ ٹوٹا طلسمِ حسرت و یاس — درِ قبول سے ٹکرا کے ہر دُعا اُلٹی

نگاہِ یار کے پھرتے ہی، ہم سے اے آتشؔ
زمانہ پھر گیا، چلنے لگی، ہوا اُلٹی

طریقِ عشق میں مارا پڑا جو دل بھٹکا
یہی وُہ راہ ہے جس میں ہے جان کا کھٹکا

سزا ہے اپنی جو دے یار ہجر کا جھٹکا
شبِ وصال کی گستاخیوں کا ہے کھٹکا

نہ بوریا بھی میسّر ہوا بچھانے کو
ہمیشہ خواب ہی دیکھا کیئے چھپر کھٹ کا

کبھی تو ہوگا ہمارے بھی یار پہلو میں
کبھی تو قصد کرے گا زمانہ کروٹ کا

نہ پھول بیٹھ کے بالائے سروِ اے قمری
چڑھے جو بانس کے اوپر، یہ کام ہے نٹ کا

عجیب بھول بھلیّاں ہے غفلتِ ہستی
جسے کہ راہ ہوئی اس سے خوب ہی بھٹکا

عجب نہیں ہے جو سودا ہو شعر گوئی سے
خراب کرتا ہے آتشؔ، زبان کا چٹکا

نگر اس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
اُلٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے، تنگ جب دیوانہ آتا ہے

ہمیشہ فکر سے یاں عاشقانہ شعر ڈھلتے ہیں
زباں کو اپنی بس اک حُسن کا افسانہ آتا ہے

تماشا گاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو
کسے اُس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے

دہن پر ہیں ان کے گماں، کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں، کیسے کیسے

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں، کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں، کیسے کیسے

عجب کیا، چھٹا روح سے جامۂ تن
لُٹے راہ میں کارواں، کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں، کیسے کیسے

دل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمہارے لئے ہیں مکاں، کیسے کیسے

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں، کیسے کیسے

تری کلکِ قدرت کے قربان آنکھیں دکھائے ہیں خوش رو جواں، کیسے کیسے

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے
پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے
مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے
ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے
جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

ہوائے دورِ مے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے

طریقِ عشق کا سالک ہے واعظوں کی نہ سن
ٹھگوں کے کہنے کا کیا اعتبار راہ میں ہے

سمندِ عمر کو اللہ رے شوقِ آسایش
عنان گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہونچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے، دشمن ہزار راہ میں ہے
تھکیں جو پانوں تو چل سر کے بل، نہ ٹھیر آتش
گُلِ مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

۳ اختر

(.....ء ؛ ۱۸۵۸ء)

قاضی محمد صادق خاں، ہگلی، صوبہ بنگال کے باشندے تھے۔ دربار اودھ میں علم و فضل، شعر و سخن کا چرچا سن کر لکھنؤ آ گئے اور ایک عرصہ تک وہاں رہے۔ غازی الدین حیدر نے ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا۔ فنِ شاعری میں مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ اور انشا و مصحفی کے زمانہ سے لے کر ناسخ اور آتش اور اُن کے شاگردوں کے وقت تک لکھنؤ کی علم و ادب کی محفلوں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا یہ قطعہ بہت مشہور رہا ہے: ؎

کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر سا قیا
دکھلا کے باغِ سبز عذاب و ثواب کا

کہنے لگا زرادِ تبختر مجھے، بہ طنز
معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا

ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
کیجے جو آپ مجھ کو نہ موردِ عتاب کا

تقویٰ ہمارے آگے ہو جب آپکا درست
اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا

مے ہو وے، کنج باغ ہو، ساقی ہو ماہ وش
اور واں کوئی مخل نہ ہو باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخِ بے حجاب
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

کھینچے ہنسی سے اپنا ملا کر وہ منھ سے منھ
یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگ خضاب کا

منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے
گر پی نہ جائے جلد یہ ساغر شراب کا

اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجیے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

طمع کی راہ سے ہے سبکو اغنیا سے غرض — خوشا وہ لوگ جنہیں ہے فقط خدا سے غرض

غمِ فراق مجھے تو ہی یار تک پہونچا — کہ آشنا کی نکلتی ہے آشنا سے غرض

وہ روئے ساحلِ امید دیکھیں کیا، جو لوگ — خدا کو چھوڑ کے رکھتے ہیں ناخدا سے غرض

تری جناب میں اختر کی عرض ہے یارب
رہے جہاں میں اُسے ترکِ مدّعا سے غرض

عجب ڈھب کی یہ تعمیر خراب آبادِ ہستی ہے
کہ پستی یاں بلندی ہے، بلندی یاں کی پستی ہے
تردّد کیوں تمہیں، اے ساکنانِ ملکِ ہستی ہے
عدم کی راہ سیدھی ہے، بلندی ہے نہ پستی ہے
ہر اک دل میں ہوائے پیرویِ نفس کافر کی
خدا کے گھر میں ہے ہے دیکھئے کیا بت پرستی ہے

حصولِ جاہ کی تدبیر جو ہم لوگ کرتے ہیں
ہماری سعی باطل دیکھ کر تقدیر ہنستی ہے

گلوں کا ہے گریباں چاک دستِ جورِ صرصر سے
صبا مضطر سی ہے اور گٹھریاں غنچوں کی کستی ہے

سمجھ ہر ایک کو ہشیار ہم آئے تھے یاں اخترؔ
بچشمِ غور جو دیکھا تو متوالوں کی بستی ہے

نہ یاں کچھ ذوقِ درماں ہے نہ فکرِ چارہ سازی ہے
برنگِ شمع اپنی زندگانی جاں گدازی ہے

تڑپ دل کی سناتی ہے جرس کی سی صدا ہر دم
غنیمت یارِ مستغنی سے اتنی دل نوازی ہے

مٹا ہرگز نہ دنیا میں نیاز و ناز کا جھگڑا
قیامت ہے بحق، پروا اں بھی شانِ بے نیازی ہے

جہاد اس کو نہیں کہتے کہ ہوئے خون انسان کا
کرے جو قتل اپنے نفس کافر کو وہ غازی ہے
غنیمت جانئے اختر کو اے یارانِ بنگالہ
یہ اپنے وقت کا ہندوستاں میں فخرِ رازی ہے

ناسخ اور آتش کے چند ہمعصر

اسیر: میر مظفر علی اسیر اپنے علم و فضل کے لئے مشہور تھے۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ ان کے کلام میں کچھ کچھ ناسخ کا رنگ نظر آتا ہے۔ دیوان دستیاب نہ ہونیکے باعث ہم ان کی غزلوں کا انتخاب پیش نہیں کر سکتے ؎

نبض بیمار جو اے رشکِ مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے محفل کی

شہیدی: کرامت علی شہیدی، بریلی کے رہنے والے تھے لیکن لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی اور وہیں زندگی گذاری، مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ منیر شکوہ آبادی کی طرح شہیدی بھی مشکل زمینوں میں اکثر طولانی غزلیں لکھتے تھے۔ اور ان کی قدرت کلام کے سب قائل تھے۔ ذوق کی طرح شہیدی کے بھی بعض اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں۔

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

بیمار محبت کو اب اللہ شفا دے
سنتے ہیں کہ ہاتھ اس سے مسیحا نے اٹھایا

ہوس: نواب مرزا محمد تقی مصحفی کے شاگرد تھے۔ کلام میں اکثر تصوف

اور اخلاق کے مضامین خوبی کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ عاشقانہ اشعار بھی پر لطف ہیں ؎

نہ پایا کھوج برسوں نقش پائے رفتگاں ڈھونڈے
نہ ہو ممکن پتہ جن کا انہیں کوئی کہاں ڈھونڈے
کدھر کو روٹھ کر جاتا رہا عہدِ شباب اپنا
نہ پایا اس مسافر کو ہزاروں کارواں ڈھونڈے

دل میں اک اضطراب باقی ہے　　یہ نشانِ شباب باقی ہے

قفس پر برگِ گل رکھنے سے اے صیاد کیا حاصل
گذشتہ صحبتوں کا اب دلانا یاد کیا حاصل
جہاں ہے آج آبادی وہاں کل ہوگا ویرانہ
اگر اک دم کی خاطر ہم ہوئے آباد کیا حاصل

غافل : منوّر خاں غافل مصحفی کے شاگرد تھے۔ ان کی ایک غزل بہت مشہور ہوئی۔

نگاہِ یار ہم سے آج، بے تقصیر پھرتی ہے
کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے، جب تقدیر پھرتی ہے

مرقع ہے مری آنکھوں میں کیا یارانِ رفتہ کا
جو نظروں کے تلے، ہر ایک کی تصویر پھرتی ہے

کبھی تو کھینچ لائے گی اُسے گورِ غریباں تک
کہ مُدّت سے ہماری خاک دامنگیر پھرتی ہے

مقامِ عشق میں شاہ و گدا کا ایک رُتبہ ہے
زلیخا ہر گلی کوچہ میں بے توقیر پھرتی ہے

فراقِ گل میں تو اتنا عبث نالاں و مضطر ہے
بہارِ رفتہ پھر اے بُلبل دل گیر پھرتی ہے

خدا شاہد ہے اس کا پھر نہیں ملتی، نہیں ملتی
طبیعت جس سے اپنی اوبتِ بے پیر پھرتی ہے
ترا دیوانہ جب سے اُٹھ گیا صحرائے وحشت سے
بگولے کی طرح سے، ڈھونڈتی زنجیر پھرتی ہے

کب اُن سبک رووں کا نشانِ قدم ملے
جو اس چمن سے مثلِ نسیمِ سحر گئے
غافل یہ مہرباں نہ ہوا وہ شباب میں
کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

⁂

باب ششم، دہلی کی شاعری کا دوسرا دور

(انیسویں صدی کا وسط)

جس زمانہ میں لکھنؤ میں عیش و عشرت کا دور دورہ تھا، دہلی میں تباہی کے بعد ایک نئی بیداری کی رو دوڑ رہی تھی۔ اور انگریزی حکومت کے زیر اثر نئی روشنی کے تاثرات بھی رفتہ رفتہ کام کر رہے تھے۔ یہاں کے شعرا نے پہلے اساتذۂ لکھنؤ خصوصاً ناسخ کا تتبع کرنے کی کوشش کی چنانچہ غالب کا ابتدائی کلام بھی کچھ اسی رنگ میں ہے۔ شاہ نصیر آخر تک مشکل ردیف اور قافیوں اور سنگلاخ زمینوں سے زور آزمائی کرتے رہے۔ لیکن دوسرے شعرا نے رفتہ رفتہ حقیقی جذبات اور خیالات اور

طرز ادا کی سادگی کی طرف توجہ کی۔ غالب کو ندرتِ خیال اور طنز یہ لطافتِ بیان کے باعث اس ملک میں طرز جدید کا بانی کہنا چاہیئے۔ مومن نے نازک خیالی کے ساتھ عاشقانہ مضامین میں رنگینی پیدا کی، اور اپنے کلام کو خوبصورت فارسی ترکیبوں اور نئی تشبیہوں اور استعاروں سے مزین کیا۔ ذوق نے اگرچہ کوئی خاص جدت نہیں پیدا کی لیکن استادانہ انداز کے ساتھ ایسی دلفریب سادگی اختیار کی کہ اُن کے بہت سے اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے کلام میں تصوف اور اخلاق کے مضامین اسی عام فہم اور دل گداز سادگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اگرچہ ان کے عاشقانہ اشعار بعض اوقات طرزِ لکھنؤ کی یاد دلاتے ہیں۔

نصیرؔ

(۱۷۶۵ء تا ۱۸۴۰ء)

شاہ نصیر الدین دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔ جو قائم چاندپوری کے تلامذہ میں سے تھے۔

شاہ نصیر کے شاگردوں کی تعداد بہت بڑی ہے جن میں ذوقؔ اور مومنؔ سب سے مشہور ہوئے۔ بڑے مشّاق شاعر تھے۔ قدرتِ کلام کا ثبوت ان کی غزلوں سے ملتا ہے جن میں سے اکثر سنگلاخ زمینوں میں ہیں۔ استعارات و تشبیہات میں جدّت طبع دکھلائی ہے۔ باوجود دہلی میں رہنے کے شاہ نصیر کا رنگ ناسخؔ سے بہت کچھ

ملتا جلتا ہے۔

عالم میں جوں مہِ نو مذکور ہے ہمارا
ہر شہر میں بھی شہرہ مشہور ہے ہمارا

خلخال طوق، قمری ہو سرو کو مُبارک
زنجیر پاس رکھنا دستور ہے ہمارا

آئینہ ساں سکندر کس کی پلک لگے ہے
سرچشمۂ محبّت معمور ہے ہمارا

دوشِ بہار پر ہے شکلِ سبوئے غنچہ
ابر و ہوا سے ساقی مسرور ہے ہمارا

انداز سے سخن کے واقف نصیر ہوں میں
ایسی غزل کا لکھنا مقدور ہے ہمارا

ہو چکی باغ میں بہار افسوس
آہ اے بلبلو ہزار افسوس

قافلہ عمر کا ہے پا بہ رکاب
زیست کا کیا ہے اعتبار افسوس

شب پروانہ کی لگن میں شمع
صبح تک روئی زار زار افسوس

سخت بیتابی سے کٹی کل رات
آج بھی دل ہے بیقرار افسوس

جان ہونٹوں پہ آگئی ہمدم — لیکن اب تک پھرا نہ یار افسوس

عمر غفلت میں کٹ گئی ہے نصیر

آہ افسوس، صد ہزار افسوس

زخمی چمن میں ہیں تری تیغِ ادا کے پھول — دہشت سے ہاتھ پاؤں گئے ہیں صبا کے پھول

آسودگانِ خاک کے شاید ہیں محوِ دید — نرگس کے دیکھتے ہیں جو آنکھیں جھکا کے پھول

دیوانہ ہوں میں آمدِ فصلِ بہار کا — خوش ہیں چمن میں چاکِ گریباں دکھا کے پھول

کرتا ہوں رو کے ہستیِ موہوم پر نظر — ہنستا ہے جب چمن میں کوئی کھلکھلا کے پھول

گلچینِ روزگار کے ہاتھوں سے اے نصیر — دیوار و در کی سیر کروں کیا بنا کے پھول

ہم پھڑک کر توڑتے، ساری قفس کی تیلیاں

پر نہ تھیں اے ہمصفیرو اپنے بس کی تیلیاں

بہرِ ایواں اور بنوا چلمن، اے پردہ نشیں
ہو گئیں بدرنگ، ہیں اگلے برس کی تیلیاں

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے
قافیہ ہیں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں

تھے گرفتارِ قفس جو پیش مرغانِ چمن
مانعِ پرواز تھیں اُن کی، قفس کی تیلیاں

کون صحرائے سخن سے چُن کے باندھے گا نصیر
تجھ سے اہلِ معنی و مضمون رس کی تیلیاں

سدا ہے اس آہ و چشمِ تر سے، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں
نکل کے دیکھو تم اپنے گھر سے، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

وُہ شعلہ رو ہے سوار توسن، اور اُس کا توسن عرق فشاں ہے
عجب ہے اک سیر دوپہر سے، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

کدھر کو جاؤں نکل کے یارب، کہ گرم و سردِ زمانہ مجھکو
دکھائے ہے شام تک سحر سے، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

وُہ تیغ کھینچے ہوئے ہے سر پر، میں سر جھکائے ہوں اشک ریزاں
دکھاؤں اے دل تجھے کدھر سے، فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

نصیرؔ لکھی ہے کیا غزل یہ، کہ دل تڑپتا ہے سُن کے جس کو
بندھی ہے یوں کب کسی بشر سے، فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

خاک سے دیکھ مری چشمِ فگار آلودہ — چشمِ قاتل ہوئی سرمہ سے غبار آلودہ
سانپ چھاتی پہ مری کیونکہ نہ لوٹے کہ وہاں — عرقِ سینہ سے پھولوں کا ہے ہار آلودہ
خوب او صاف ہیں ہر چند بظاہر لیکن — دل تو جوں شیشۂ ساعت ہیں غبار آلودہ
زاہدا تیری طرح کر کے زمیں پر سجدہ — ق — میں جبیں کو نہیں رکھتا ہوں غبار آلودہ
بندۂ عشق ہوں اے حلقہ بگوشِ تسبیح — دل ہے تا تار مرا دستِ نگار آلودہ

چشمِ دل اپنی نہ بیدار ہوئی حیف نصیر
خوابِ غفلت میں رہے لیل و نہار آلودہ

گرمیٔ بازار آہ دیکھ دلا اور ہے
کل کی ہوا اور تھی، آج ہوا اور ہے

اے ستم ایجاد ہم تجھ سے کہاں تک کہیں
طرزِ جفا اور ہے رسمِ وفا اور ہے

دامنِ گل تو نے گو چلتے ہوئے چھو لیا
بات لگاوٹ کی پر، بادِ صبا، اور ہے

کبکِ دری تو نے کب پائی یہ رفتار اب
چال صنم کی مرے نامِ خدا، اور ہے

کس لئے دلگیر ہے غنچہ صفت اے نصیر
باغِ جہاں میں ترے، عقدہ کشا اور ہے

مژہ پہ اشک ڈھلا تھم رہے رہے نہ رہے
بجا ہے خانۂ شبنم رہے رہے نہ رہے

بہ درمیاں سے اُٹھا دے حجاب کا پردہ
بلا سے تیری اگر ہم رہے رہے نہ رہے

اِک عالم اب تو ہے پھر آ کے دیکھئے، اے دل
خدا ہی جانے یہ عالم رہے رہے نہ رہے

ترا ہیں دیکھ کے عالم ہوں اور عالم ہیں
کسے خبر ہے یہ عالم رہے رہے نہ رہے

فراقِ یار میں رونا نہ چھوڑیو تو نصیر
بلا سے دیدۂ پُرنم رہے رہے نہ رہے

∴

مومن

(۱۸۰۰ء ÷ ۱۸۵۱ء)

حکیم مومن خاں۔ اصلی باشندے کشمیر کے تھے۔ ان کے دادا دہلی آبسے تھے اور شاہی طبیبوں میں تھے۔

مومن کی ذہانت اور قابلیت کے سب قائل تھے۔ علاوہ شاعر ہونے کے اچھے طبیب اور مُنجِّم تھے۔ شطرنج میں ماہر تھے۔ شاعری میں کبھی کبھی طبابت اور نجوم کی طرف اشارہ ہو جاتا تھا۔

کیا لگا دستِ دِلآرام سے ہاتھ　　　　دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

اِن نصیبوں پر کیا اختر شناس

آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

مومن کی نازک خیالی، رنگینی اور شیریں بیانی مشہور ہے۔ حُسن پرست تھے۔ اسی لئے ان کی عاشقانہ شاعری میں واقعات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ تشبیہات اور استعارات دلفریب استعمال کرتے ہیں۔ ان خصوصیات کے باعث مومن اردو کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز شعرا میں سے ہیں۔ تخلص کا استعمال اکثر بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔

پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع

مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے

جورِ اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو!

نامِ عشقِ بتاں نہ لو مومن   کیجئے بس خدا خدا صاحب

مومنؔ کے شاگردوں میں شیفتہؔ، تسکینؔ اور نسیمؔ دہلوی قابلِ ذکر ہیں۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

اُڑتے ہی رنگِ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں
اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دُشنام یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس، نزاکتِ آواز دیکھنا

دیکھ اپنا حالِ زار منجّم ہوا رقیب
تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

میری نگاہِ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

کیا ہوا، ہوا گر وُہ بعدِ امتحاں اپنا
بے گنہ سزا پائی اب وُہ دل کہاں اپنا

خار و خس میں گلشن کے بوئے گُل جو آتی تھی
رشک سے کیا برباد آپ آشیاں اپنا

روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دے گا
اُن کو شوقِ آرائش، دل ہے بدگماں اپنا

بعدِ مدّت اس کوُ سے یوں پھرے بہ تنگ آ کر
جائے جائے پھرتے ہیں، پوچھتے مکاں اپنا

دشنہ چھین لیگا کیا ہم نشیں شبِ فرقت
آپ جب نہیں اپنے، کون میری جاں اپنا

صبر بعد آسائش، اس قلق پہ مشکل تھا
عیش جاوداں نکلا، رنج جاوداں اپنا

عشقِ بُت میں خود اب تو در خورِ پرستش ہیں
نام ہوگیا اتنا، گم کیا نشاں اپنا

دل کی بیقراری سے ہر تپش زمیں فرسا
بہرِ خرمنِ گردوں شعلہ ہر فغاں اپنا

دیکھئے پسِ مردن حالِ جسم وجاں کیا ہو
مدعیِ زمیں اپنی، دشمن آسماں اپنا

دیر و کعبہ یکساں ہیں عاشقوں کو اے مومن
ہو رہے وہیں کے ہم جی لگا، جہاں اپنا

بے وفا کہنے کی شکایت ہے
تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں　　سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرضِ مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب[1]　　غیر اور تم بھلے، بھلا صاحب
کیوں اُلجھتے ہو جنبشِ لب سے　　خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب
ستم، آزار، ظلم، جور و جفا　　جو کیا سو بھلا کیا، صاحب
کس پہ بگڑے تھے کس پہ غصّہ تھا　ق　رات تم کس پہ تھے خفا صاحب
کس کو دیتے تھے گالیاں لاکھوں　　کس کا شب ذکرِ خیر تھا صاحب

نامِ عشقِ بتاں نہ لو مومن
کیجئے بس خدا خدا صاحب

[1] کہتے ہیں کہ مومن کی ایک معشوقہ کا نام "صاحب" تھا۔

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں
لب نہیں کھلنے میں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

دوست کرتے ہیں ملامت، غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں

شکوہ حرفِ تلخ کا یا شور بختی کا گلہ
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزا کہنے کو ہیں

میں گلہ کرتا ہوں اپنا، تو نہ سن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وُہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے، پھر ہم بھی کچھ
آرزوہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بیقرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

وُہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وُہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر، وُہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وُہ نئے گلے وُہ شکایتیں، وُہ مزے مزے کی حکایتیں
وُہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو، تو اشارتوں ہی میں گفتگو
وُہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم، تو وفا جتانے کو دم بہ دم
گِلۂ ملامتِ اقربا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی، کہ تمہارے جی کو بُری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کیا ایک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جیسے آپ گنتے تھے آشنا، جیسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے، انداز تو دیکھو
ہے بُلہوسوں پر بھی ستم، ناز تو دیکھو

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح
طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو

ارباب ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے
کم طالعیٔ عاشقِ جاں باز تو دیکھو

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھے وہ
بدنامیٔ عُشّاق کا اعزاز تو دیکھو

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے، آواز تو دیکھو

دیں پاکیٔ دامن کی گواہی مرے آنسو
اُس یوسفِ بیدرد کا اعجاز تو دیکھو

جنّت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بُتوں سے
جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو

کب تک نبھائیے بُتِ ناآشنا کے ساتھ — کیجیے وفا کہاں تلک اُس بیوفا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجرِ یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار، کہ خوابِ عدم سے بھی — ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

یارب وصالِ یار میں کیونکر ہو زندگی — نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر — یُوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

ہر دم عرق عرق نگہِ بے حجاب ہے — کس نے نگاہِ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

مرنے کے بعد بھی وہی آوارگی رہی — افسوس جاں گئی نفسِ نارسا کے ساتھ

دستِ جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا — اُلجھا ہے ان سے شوخ کے بندِ قبا کے ساتھ

میں کینے سے بھی خوش ہوں کہ سب یہ تو کہتے ہیں — اس فتنہ گر کو لاگ ہے اس مبتلا کے ساتھ

اللہ رے گم رہی، بُت و بُت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی — خبر ہے لاش پہ اُس بیوفا کے آنے کی

ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشکِ خونیں کی مرے
سکھائی طرز اُسے دامن اُٹھا کے آنیکی

سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح
کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنیکی

مجھے یہ ڈر ہے کہ مومن کہیں نہ کہتا ہو
مری تسلّی کو، روزِ جزا کے آنے کی

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہونگے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے، کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے، کیا تجھ سے بھی ناداں ہونگے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان، کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے

عُمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن!
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

❖

ذوق

(۱۷۸۹ء — ۱۸۵۴ء)

شیخ محمد ابراہیم - دہلی میں پیدا ہوئے - ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے - لیکن جلد ہی اُستاد سے علیحدہ ہو گئے - اور ادبی حلقوں میں ان کی اپنی استادی تسلیم کر لی گئی - دربار میں رسائی ہوئی، اور بہادر شاہ ظفر ان کے شاگرد ہوئے -

ذوق کے قصائد سودا کی طرح فارسی اساتذہ سے ٹکر لیتے ہیں - غزلوں میں خوبصورت بندشیں اور محاورات کا برمحل استعمال ان کی خصوصیات ہیں - مضامین اخلاقی اور صوفیانہ نہایت خوبصورتی سے باندھے ہیں - عاشقانہ غزلیں سادہ مگر طرزِ ادا کی خوبی

کے باعث اکثر دلفریب ہیں۔

انگریزی شاعر پوپ کی طرح ذوقؔ کے بہت سے اشعار ضرب المثل ہوگئے ہیں۔

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا — پر ذکر ہمارا، نہیں آتا نہیں آتا

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا — گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہادیں — شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق، مجھے کیا نہیں آتا

عہدِ پیری، شباب کی باتیں — ایسی ہیں، جیسے خواب کی باتیں

اس کے گھر لے چلا، مجھے دیکھو — دلِ خانہ خراب کی باتیں

واعظا چھوڑ ذکرِ نعمتِ خُلد — کر شراب و کباب کی باتیں

حرف آیا جو آبرو پہ مری — ہیں یہ چشمِ پُر آب کی باتیں

یاد ہیں مہ جبیں، کہ بھول گئے — وہ شبِ ماہتاب کی باتیں
تجھ کو رسوا کریں گی خوب اے دل — تیری یہ اضطراب کی باتیں
سنتے ہیں اس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم — کس مزے سے عتاب کی باتیں
دیکھ اے دل نہ چھیڑ قصۂ زلف — کہ یہ ہیں پیچ و تاب کی باتیں

ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوقؔ
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

گذرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں — کہ جیسے جائے کوئی کشتئ دُخانی میں
رُکا دُخوب نہیں طبع کی روانی میں — کہ بُوئے فساد کی آتی ہے بند پانی میں
کہانیاں ہیں حکایاتِ خضر و آبِ بقا — بقا کا ذکر ہے کیا اِس جہانِ فانی میں

نہیں خضاب سے مطلب ہمیں، یہ موئے سفید
سیاہ پوش ہوئے ماتمِ جوانی میں

موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو
غسلِ میّت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

ہو تو ہو آباد کیونکر یہ خراب آباد دل
عشقِ غارت گر اگر دنیا سے غارت ہو تو ہو

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرمِ ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو، لیکن محبّت ہو تو ہو

آدمیّت سے ہے بالا، آدمی کا مرتبہ
پست ہمّت یہ نہ ہو، گو پست قامت ہو تو ہو

اب زباں پر بھی نہیں آتا کبھی اُلفت کا نام
اگلے مکتوبوں میں کچھ رسمِ کتابت ہو تو ہو

آج اک پگڑی ہوئی تھی میکدے میں رہنِ مے
ذوقؔ وُہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

آنکھ اُس پُر جفا سے لڑتی ہے
جان کُشتی قضا سے لڑتی ہے

شعلہ بھڑکے نہ کیونکہ محفل میں
شمع تجھ بن، ہَوا سے لڑتی ہے

قسمت اُس بُت سے جالڑی اپنی
دیکھو، احمق خدا سے لڑتی ہے

تیرے بیمار کے سر بالیں
موت کیا کیا شفا سے لڑتی ہے

زالِ دنیا سے صلح کی کس دن
یہ لڑائی سدا سے لڑتی ہے

دیکھو اُس چشمِ مست کی شوخی
جب کسی پارسا سے لڑتی ہے

ساقیا ہوں جو صبوحی کی نہ عادت والے
صبح محشر کو بھی اُٹھیں نہ ترے متوالے

رہے جُوں شیشۂ ساعت وُہ مکدّر دونوں
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

کس مرض کی ہیں دوا یہ لبِ جاں بخش ترے
جاں بلب ہیں ترے آزارِ محبّت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

نہ ستم کا کبھی شکوہ، نہ کرم کی خواہش
دیکھ تو، ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

تو مرے حال سے غافل ہے، پر اے غفلت کیش!
تیرے اندازِ تغافل نہیں غفلت والے

ناز ہے گُل کو نزاکت پہ چمن میں، اے ذوق!
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

مرے جو ہجر کے، عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گُل کبھی نہ تمنّائے رنگ و بو کرتے

عجب نہ تھا کہ زمانے کے انقلاب سے ہم
تیمّم آب سے، اور خاک سے وضو کرتے

سراغ عمر گذشتہ کا ڈھونڈئے گر ذوقؔ
تمام عمر گذر جائے جستجو کرتے

خدا دے، دوربینی اندراس چشمِ تصوّر کو
کہ لاکھوں کام اس سے دور کے بے دوربیں نکلے

مرے دل میں جو حسرت ہے نکالوں میں کہاں اُسکو
نہ وہ زیرِ فلک نکلے، نہ وُہ زیرِ زمیں نکلے

سنا کرتے تھے شہرہ ذوقؔ جن کی پارسائی کا
وُہ سب یارِ خرابات اپنے نکلے، ہمنشیں نکلے

منھ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

لیتے ہیں ثمر، شاخ ثمر ور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقت کرم اور زیادہ

درویش ہے وہی جو ریاضت میں چست ہو
تارک نہیں فقیر بھی راحت پرست ہے

اے ذوق تکلّف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے ہے وہ جو تکلّف نہیں کرتا

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر، دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر

برنگِ غنچۂ پیکاں و غنچۂ تصویر
نہ دیکھا اپنا شگفتہ کسی بہار میں دل

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا مِلنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ منھ لگا　　چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

بنایا آدمی کو ذوق ایک جُزوِ ضعیف　　اور اس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کیلیٔے

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا　　کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

کہاں ہم اور کہاں غم، ہم کو غم سے کچھ غرض، مطلب
مگر اے حضرتِ عشق، آپ نے یہ مہربانی کی

ہم ہیں غلام اُن کے جو ہیں وفا کے بندے
اس کو یقین جانو، گر ہو خدا کے بندے

ہم اور غیر دونوں، اک جا بہم نہ ہوں گے
ہم ہوں گے، وہ نہ ہوگا، وہ ہوگا ہم نہ ہوں گے

خط بڑھا زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

اگر انسان قانع ہو، غنی ہووے دو عالم سے — ہوا و حرص لیکن اس کی مٹّی خوار کرتی ہے

کوئی ان تنگ دہانوں سے محبّت نہ کرے — یہ اگر تنگ کریں، منہ سے شکایت نہ کرے

کتنے مفلس ہو گئے، کتنے تونگر ہو گئے
خاک میں جب مل گئے، دونوں برابر ہو گئے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی
جب یہ عاصی عرقِ شرم میں تر جائیں گے
ذوقؔ جو مدرسے کے بگڑے ہوئے ہیں مُلّا
اُن کو میخانہ میں لے آؤ، سنور جائیں گے

❖

غالب (اسد)

(۱۷۹۶ء ؛ ۱۸۶۹ء)

مرزا اسداللہ خاں، غالب، پہلے اسد تخلص کرتے تھے، آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں دہلی آگئے۔ اور وہیں زندگی گذار دی۔ حضرت امیر خسرو سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اُن کے قریب ہی نظام الدینؒ میں دفن ہیں ؎

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

مرزا فنِّ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ ہوئے، نہ کسی کی پیروی کی، بلکہ اپنا ایک نیا

انداز نکالا، جو انہیں پر ختم ہو گیا۔ اردو غزل گوئی میں میر تقی میرؔ کے بعد کسی دوسرے کو یہ درجہ نصیب نہ ہوا ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
سنتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

ان دونوں حضرات کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ میرؔ سچے تغزل کے بادشاہ ہیں۔ غالبؔ کے یہاں فلسفہ، تصوّف، عقل و دانش، فطرتِ انسانی کا مطالعہ، طنز اور کبھی کبھی ایک لطیف ظرافت، سبھی کچھ پائے جاتے ہیں۔ اور ہر مضمون اپنی انتہا کو پہونچا دیا گیا ہے ؎

ہو چکیں، غالبؔ، بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

غالب کے خطوط جو عودِ ہندی، اور اردوئے معلیٰ کے نام سے مشہور ہوئے، اردو زبان کی بہترین انشاپردازی کا نمونہ ہیں۔ نظم و نثر دونوں کی خاص کشش کا باعث خود مرزا کی شخصیت ہے۔ جو ان کی تصانیف میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اور جس کو انسانی دل و دماغ کی اعلیٰ ترین ترقّی کی مثال سمجھنا چاہیئے۔

مرزا اپنے ماحول سے بالکل علیحدہ اور اس سے کہیں بالاتر نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط یا غزلیں پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت اچھی جدید یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ دنیا کی سیر و سیاحت سے اس کو تکمیل کر کے آئے۔ اور دربار مغلیہ میں صرف بطور ایک مہمان کے ٹھہرے ہوئے تھے۔

معمولی عاشقانہ مضامین بھی ایسے انداز سے باندھے ہیں کہ ایک جدّت اور انوکھا پن پایا جاتا ہے ؎

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں — خدا وہ دن کرے، جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

نیند اُس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اسکی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

اہلِ ذوق مرزا کے فارسی کلام کو ان کی اردو شاعری سے بلند تر سمجھتے ہیں۔ اردو کے ابتدائی کلام پر بھی فارسی کا غلبہ نظر آتا ہے۔ خیالات اتنے بلند تھے کہ یہ نئی زبان ان کا بوجھ مشکل سے سنبھال سکتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اپنا ایک راستہ نکال لیا۔ اور آخر کی اکثر غزلیں نہایت صاف اور سلیس ہیں۔ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے کلام کی شرح لکھنے کی ضرورت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مرزا غالب کے مختصر دیوان کے لئے کم از کم سات شرحیں لکھی گئیں اور مولانا حسرت موہانی نظم طباطبائی اور بیخود موہانی جیسے ذی علم لوگوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔

اس مختصر مجموعہ میں آپ غالب کی تمام مقبول غزلیں نہ پائیں گے۔ اس لئے کہ پورا دیوان منتخب ہے۔ اور اس میں سے مزید انتخاب کرنا ناممکن ہے۔

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ جفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

یہ نہ تھی ہماری قسمت، کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدہ پر جئے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے، کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا، کہ سر یاد آیا

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا / آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ / اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا / بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پیشہ میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام / ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق / آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا / جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے / ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل، اور ہی تدبیر کر کہ میں / شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار / لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دِل نہیں رہا

ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے، بزمِ غیر میں یارب — آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر، اور ہم بنا سکتے — عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں اُن کو دکھلادوں — انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا — ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو — دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

جور سے باز آئیں، پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منھ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ کچھ بھی ہو، تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب! اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے، پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ، کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشا غالبؔ

چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اسکے ہجر میں

بے تکلف دوست ہو، جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک

مجھکو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ

سر کرے ہے وُہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھکو روتے دیکھ پاتا ہے اگر

ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے

یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

٭

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا، میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا

ہوئی معزولیٔ انداز و ادا، میرے بعد

شمع بجھتی ہے، تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا، میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا، میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی

کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا، میرے بعد

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

⁂

ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبّت، تو گذرتا ہے گماں اور
یا رب وُہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دِل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین
کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں، سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور
مِٹ جائیگا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا — ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو، قیامت کو ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر، جواں تھا ابھی عارفؔ — کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چاردہم تھے، مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

؎ یہ مرزا کے بھتیجے عارف کا مرثیہ ہے جن کو انہوں نے بیٹا بنایا تھا اور جو دو چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر جوانی میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی — بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری نہ بہ ہر حال یہ مدّت خوش و ناخوش — کرنا تھا جواں مرگ، گذارا کوئی دن اور

ناداں ہیں جو کہتے ہیں، کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

کیونکہ اس بت سے رکھوں جان عزیز — کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے — ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لاتے ہی بنے گی، غالب
واقعہ سخت ہے، اور جان عزیز

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل　　میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد　　ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وُہ بھی دن ہو کہ اُس ستم گر سے　　ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز

اے ترا جلوہ یک قلم انگیز　　اے ترا ظلم سر بسر انداز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا　　میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا

اے دریغا، وُہ رندِ شاہد باز

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک[1]

عاشقی صبر طلب، اور تمنا بیتاب　　دل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک

---

[1] اشک پر آنکھ تک آتے جو قیامت گذری　　وہ نہ گذری کسی قطرے پہ گہر ہونے تک (منسوخ)

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہوجائیں ہم، تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے، اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ، کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال، کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال، کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ، غالبؔ

وُہ عناصر میں اعتدال، کہاں

ہم سے کھل جاؤ، بوقتِ مے پرستی، ایک دن

ورنہ ہم چھیڑیں گے، رکھ کر عذرِ مستی، ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں

رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو ہی، اے دل غنیمت جانیئے

بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی، ایک دن

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ، پیش دستی ایک دن

کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں، نیند آئے عمر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دَورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

غالبؔ چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کئے

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسے، بغیر التجا کئے

ضد کی ہے اور بات، مگر خُو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے

غالب تمہیں کہو، کہ ملیگا جواب کیا
ہر چند تم کہا کئے اور وُہ سُنا کئے

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

وُہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب، کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بُو الہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فرداودی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا　　کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں، تمہیں

وُہ ولولے کہاں، وُہ جوانی کدھر گئی

کوئی دن گر زندگانی اور ہے　　ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں　　سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں　　پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے

دے کے خط منھ دیکھتا ہی نامہ بر　　کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے　　ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ　　ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو　　ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے، اور صبحدم　　دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

عشق نے، غالبؔ، نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے　　یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر　　جائے مے، اپنے کو کھینچا چاہیے

چاک مت کر جیب، بے ایامِ گل　　کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے　　چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو، وُہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو اُنہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

بوجھ وُہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وُہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وُہ آتش، غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یادِ شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی، مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھنچتا جائے ہی مجھ سے

وُہ بدخُو، اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہی مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھُوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلّف[1] برطرف، نظّارگی میں بھی سہی لیکن
وُہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہی مجھ سے

[1] خاص کروں میں ہی نظّارہ تب تو دید کی لذّت ہے
کو کھلی یہ آنکھیں اُس دن جلوہ جس دن عام کیا (سودا)

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے، پر کس وقت

نفَس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

چلتا ہوں تھوڑی دور، ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے، مگر اس قدر آباد نہیں
کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہرئ یارانِ وطن یاد نہیں!

ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں　　آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے

ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں　　سادہ پُرکار ہیں خوباں غالب

یارب، زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ مُلاقات چاہیئے

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغِ ناتمامی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یونہی دکھ، کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب، ملے میری زندگانی

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پروا　　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ظفؔر

(۱۷۷۵ء تا ۱۸۶۲ء)

سراج الدین محمد بہادر شاہ، خاندانِ مغلیہ کے آخری بادشاہ، اور دنیا کے بدنصیبوں میں سے تھے۔ ان پر اور ان کے خاندان پر جو مصائب گذرے وہ ایک عجیب عبرت انگیز داستان ہے۔ غدر کے بعد معزول کر کے رنگون بھیج دئے گئے اور وہیں انتقال کیا۔

پہلے شاہ نصیؔر پھر ذوقؔ، اور ان کے بعد مرزا غالبؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ فنِ موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ کلام پُر اثر ہے۔ تصوّف کا رنگ غالب ہے۔ زبان اور طرزِ ادا میں ایک دلفریب سادگی پائی جاتی ہے۔

کسی نے اُس کو سمجھایا تو ہوتا
کوئی یاں تک اُسے لایا تو ہوتا

مزہ رکھتا ہے زخمِ خنجرِ عشق
کبھی، اے بوالہوس کھایا تو ہوتا

جو کچھ ہوتا سو ہوتا، تو نے تقدیر
وہاں تک مجھ کو پہونچایا تو ہوتا

کیا کس جرم پر تو نے مجھے قتل
ذرا تو، دل میں شرمایا تو ہوتا

دل اُس کی زلف میں اُلجھا ہے کب سے
ظفر، اک روز سلجھایا تو ہوتا

*

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا، وُہ جو پردہ سا بیچ میں تھا، نہ رہا
رہے پردہ میں اب نہ وُہ پردہ نشیں، کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہُنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ترے رُخ کے خیال میں کون سے دن، اُٹھے مجھ پہ نہ فتنۂ روزِ جزا
تری زلف کے دھیان میں کون سی شب، مرے سر پہ ہجومِ بلا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے ہیں اب، کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

کئی روز ہیں آج وُہ مہر لقا، ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا، اسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا

ترے خنجر و تیغ کی آبِ رواں، ہوئی جبکہ سبیلِ ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں، کوئی تشنۂ آبِ بقا نہ رہا

اُسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں، مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کئے لاکھ فریب کروڑ فسوں، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا، وُہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا — یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

خاکساری کیلئے گرچہ بنایا تھا مجھے — کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

نشّۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو — عُمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے — قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دورئ ساقی سے مجھے — تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا

شعلۂ حُسن چمن میں نہ دکھایا اس نے — ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دُنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

جب کِھلکھلا کے ساقئ گلفام ہنس پڑا — شیشے نے قہقہے کئے، اور جام ہنس پڑا

غنچہ کا منھ ہے کیا کہ تبسّم کرے گا پھر — گلشن میں گر وہ شوخ گل اندام ہنس پڑا

دنداں کی تاب دیکھ کے انجم ہوئے خجل — وُہ مہ جبیں جو شب کو لبِ بام ہنس پڑا

کچھ تو خوش آئیں مجھ کو تری بد زبانیاں — میں سُن کے تیرے مُنھ سے جو دشنام ہنس پڑا

بارش کے وقت چمکے ہے بجلی بھی کیا ہوا
رونے پہ میرے گر وہ دلآرام ہنس پڑا

کیا بات یاد آگئی اس کو کہ اے ظفرؔ
وہ یک بیک جو حسن کے مزام ہنس پڑا

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دِیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا
مجھے دفن کر چکو جس گھڑی، تو یہ اس سے کہنا کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشقِ زار تھا، اسے زیرِ خاک چھپا دیا
مری آنکھ جھپکی تھی ایک پل، مرے دل نے چاہا کہ اُٹھ کے چل
دلِ بیقرار نے او میاں، وہیں چٹکی لے کے جگا دیا
میں نے دل دیا میں نے جان دی، مگر آہ تو نے نہ قدر کی
کسی بات کو جو کبھی کہا، اُسے چٹکیوں میں اُڑا دیا

نہ درویشوں کا خرقہ چاہیئے نے تاجِ شاہانا
مجھے تو ہوش اتنا دے رہوں میں تجھ پہ دیوانا
غنیمت جان جو دم گذرے کیفیت سے گلشن میں
دیئے جا ساقیِ پیماں شکن بھر بھر کے پیمانا
کچھ ایسا ہو کہ جس سے منزلِ مقصود کو پہنچوں
طریق پارسائی ہووے یا ہو راہِ رندانا
یہ ساری آمد و شد ہے نفس کی آمد و شد پر
اسی تک آمد و شد ہے نہ پھر جانا نہ پھر آنا

نہ ہنسو دیکھ کے تدبیر کو پلٹے کھاتے
دیر لگتی نہیں تقدیر کو پلٹے کھاتے
یوں نظر یار کی پلٹی کہ نہ دیکھا ہم نے
اس طرح برق کی شمشیر کو پلٹے کھاتے
بخت برگشتۂ عاشق نے نہ کھایا پلٹا
عمر گذری فلک پیر کو پلٹے کھاتے

اے ظفرؔ اس سے نہ کر بات کہ دیکھا سو بار
ہم نے اس یار کی تقریر کو پلٹے کھاتے

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بیقراری تجھے اے دِل کبھی ایسی تو نہ تھی

تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

عکسِ رخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا
تاب تجھ میں مہ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفرؔ سے ہر بار
خو تری حورِ شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

بھلی کہئے برائی ہوتی ہے
مُنھ سے نکلی پرائی ہوتی ہے

اُن کے دل میں غبار ہے دیکھیں
کس طرح سے صفائی ہوتی ہے

اور کو دیکھ وُہ نہیں سکتے وُہ جنہیں خود نمائی ہوتی ہے

اپنے مرنے کا غم نہیں، لیکن ہائے تجھ سے جدائی ہوتی ہے

اے ظفرؔ ہے جدھر وُہ بُت پھرتا

اُس طرف سب خدائی ہوتی ہے

روشِ گل ہیں کہاں یار ہنسانے والے

ہم کو شبنم کی طرح سب ہیں رُلانے والے

سوزشِ دل کو نہیں اشک بُجھانے والے

بلکہ ہیں اور بھی یہ آگ لگانے والے

خاک بھی ہو گی ترے کوچے میں اپنی برباد

ہم تو مر کر بھی یہاں سے نہیں جانے والے

دل کو کرتے ہیں بتاں تھوڑے سے مطلب پہ خراب

اینٹ کیواسطے مسجد ہیں یہ ڈھانے والے

خاک میں ہم کو مٹاتے ہیں وُہ جُوں نقشِ قدم
زیرِ پا جن کے ہیں ہم آنکھیں بچھانے والے

خط مرا پڑھ کے جو کرتے ہیں وُہ پرزے پرزے
اے ظفرؔ کچھ تو پڑھاتے ہیں پڑھانے والے

∴

غالب اور مومن کے ہمعصر

شیفتہ (۱۸۰۶ء تا ۱۸۶۹ء): نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، دہلی کے ادبی حلقوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ مومن اور غالب سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ اور حالی کے خاص احباب میں سے تھے۔ ایک تذکرۂ شعرا بنام "گلشنِ بیخار" مرتب کیا جس سے اکثر تنقید نگاروں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

کس لئے لطف کی باتیں ہیں یہ پھر　　　کیا کوئی اور ستم یاد آیا

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ　　　طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذّت گناہ میں

شاید اسی کا نام محبّت ہے شیفتہ   اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

تسکین: میر حسین تسکین۔ پہلے شاہ نصیر سے مشورۂ سخن کرتے تھے لیکن بعد کو مومن کے شاگرد ہوئے۔ اور انہیں کا رنگ اختیار کیا۔ آخر عمر دربار رامپور کے زیرِ سایہ بسر کی اور وہیں انتقال کیا۔

جس وقت نظر پڑتی ہے اس شوخ پہ تسکین
کیا کہئے کہ جی میں مرے کیا کیا نہیں آتا

چھیڑوں ہزار طرح سے تم کو خفا کروں
قابو میں میرے دل ہو تو کیا جانے کیا کروں

فتنۂ محشر کا تھا سب کو گماں   تجھ کو پہچانا تری رفتار سے

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے   کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

آزردہ - (۱۷۸۷ء-۱۸۶۸ء) مفتی صدرالدین۔ اپنے زمانہ کے علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ شعر وسخن میں میر نظام الدین ممنون سے مشورہ کرتے تھے۔ بقول فرحت اللہ بیگ اس پایہ کے عالم شاعر نہیں ہوتے ہیں، اور اگر ہوتے ہیں تو استاد ہو جاتے ہیں ؎

باتوں سے میری کب تہ و بالا جہاں نہیں　　کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں
افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند　　کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں　　اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
آزردہ ہونٹ تک نہ ملے اسکے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

نیّر رخشاں: نواب ضیاء الدین احمد خاں۔ دہلی کے رؤسا میں سے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ مرزا غالب کے شاگرد ہوئے ؎

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں　　ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدہ پر — گذرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
دل میں مضمر ہے معنیِ باقی — کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالعِ بد سے نیّرِ رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہے وصال ہمیں

ثاقبؔ : نواب شہاب الدین خاں۔ نواب ضیاء الدین خاں کے صاحبزادے اور سائلؔ دہلوی کے والدِ ماجد تھے۔ مرزا غالبؔ کے شاگرد ہوئے۔ ان بزرگوں کا کلام زبانِ دہلی کی فصاحت کا نمونہ ہے ؎

ہم قوّتِ جذبِ دل دکھائیں — اور پھر وُہ ہمارے گھر نہ آئیں
کیا چیر کے سینہ دل دکھائیں — کچھ حال سُنو تو ہم سُنائیں
اے بخت کہاں تلک بُرائی — اے چرخ کہاں تلک جفائیں
جو کام ہیں غیر کے ہوئیں صرف — افسوس، وُہ دلرُبا ادائیں
شاید کہ ہے گرمِ نالہ ثاقبؔ — چلتی ہیں شرر فشاں ہوائیں

نظام : سید نظام علی شاہ۔ بیمار شاگرد مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ ۱۸۷۲ء میں رامپور میں انتقال کیا۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

دینا کسی کا ساغرِ مے یاد ہے نظام
مُنھ پھیر کے اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

⁂

بابِ ہفتم: دربارِ اودھ کی شاعری

(اُنّیسویں صدی کا وسط)

ناسخ اور آتش کے شاگردوں کے زمانہ میں لکھنؤ کی شاعری رفتہ رفتہ دربار کے زیرِ اثر جذباتی رنگ کو چھوڑ کر تصنّع، زیب و زینت اور مناسباتِ لفظی کی طرف مائل ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ جو طرز اس زمانہ کے شعرا نے اختیار کیا اس میں بھی کامیاب غزل لکھنا بہت مشکل تھا، اور اس کے لئے سالہا سال کی مشق

اور اساتذہ کی توجّہ درکار ہوتی تھی۔ اگرچہ زمانۂ حال کے خیالات کے مطابق یہ رنگ پسندیدہ نہیں، لیکن اس دور کے شعرا کا کلام پڑھتے وقت یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اُس زمانہ میں ایسی ہی شاعری کی قدر تھی، اور اسی میں شعرا اپنی قدرتِ کلام دکھلانے کی کوشش کرتے تھے ÷

وزیر

(۱۷۹۵ء تا ۱۸۵۴ء)

خواجہ محمد وزیر۔ شیخ ناسخ کے شاگرد۔ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تھے۔ آزاد منش اور قناعت پسند ہونے کی وجہ سے دربار سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ کلام استاد کے رنگ کا ہے۔ اور زبان و محاورہ کی صحت کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں کو منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو، یوسفِ بے کارواں ہو کر

کیا غیروں کو قتل اس نے، موئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی، دوستو، آئی نصیبِ دشمناں ہو کر

بناوٹ نے بگاڑا، باتیں سنوائیں خموشی نے
نہ پوچھو، ہم نے کیا ہی منہ کی کھائی بے زباں ہو کر

ادا سے جھک کے ملتے ہو، نگہ سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو، ناوک لگاتے ہو کماں ہو کر

جوابِ نامہ کیا لایا، تنِ بیجاں ہیں جان آئی
گیا یاں سے کبوتر، واں سے آیا مرغِ جاں ہو کر

کہیں گر زندہ درگور لے وزیرابؔ وہ تو زیبا ہے
کیا ہے ہیں نے پیدا، سنگِ مرقد سخت جاں ہو کر

ذرا تو دیکھئے وہ ہم کو آکر — کوئی دن اور بھی اے دم وفا کر
اگر پوچھے وہ بربادی ہماری — صبا، کہدیجیو کچھ خاک اُڑا کر
ہزاروں ہوگئے ٹکڑے گریباں — چلے اس ناز سے دامن اُٹھا کر

وزیر اب تا کجا یہ بُت پرستی
کسی دن تو بھلا یادِ خدا کر

کون جیتا ہے اے صنم مر کے — آؤ تو دیکھ لیں نظر بھر کے
شکر ہے اِن بُتوں کے کوچہ میں — پہونچے ہیں ہم خدا خدا کر کے
مُنھ دکھانے کا کس نے وعدہ کیا — منتظر ہیں جو روز محشر کے
کس خرابی سے کاٹی ہے شب ہجر — اب تلک ہم جیئے ہیں مر مر کے
اے صنم ایک تو ہے غیرتِ گُل — بخدا، ورنہ بُت ہیں پتھر کے

---

۵ دیوانہ ہو کے کوئی پھاڑا کرے گریباں — ممکن نہیں کہ دامن وہ بے خبر سنبھالے (آتش)

کرے طوفاں بپا وزیر یہ بحر
لکھوں مضموں جو دیدۂ تر کے

رند

(۱۷۹۷ء تا ۱۸۵۵ء)

نواب سید محمد خاں رند فیض آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں زندگی گذاری۔ آتش کے شاگرد تھے۔ اور انہیں کا طرز سخن اختیار کیا۔ عاشقانہ اور صوفیانہ مضامین نہایت خوبی سے نبلاہے ہیں۔ کلام میں سادگی اور اثر ہے۔

یہ آج صاحب طبل و علم ہے کل وہ ہے — ہے اپنے نام کی نوبت ہر اک بجا جاتا
محیطِ دہر میں اِستادہ صورت کشتی — دکھائی دیتا ہوں سب کو یہ ہوں چلا جاتا
کوئی یہ بڑھ کے مرے ساتھ والوں سی کہدے — یہ ناتواں ہے پسِ قافلہ رہا جاتا

خبر نہیں ہے کہاں جاؤں گا، چلا ہوں کہاں — مثالِ ریگِ پریدہ ہوں، پر اڑا جاتا
نہیں ہے دست و قلم اختیار میں قاصد — زبانی کہیو کہ، خط تو نہیں لکھا جاتا
ہماری آپ کی بس آج سے ہنسی موقوف — ذراسی بات میں غصہ ہے تم کو آجاتا
اکیلے منزلِ ہستی میں کیا کروگے، آنند
چلو عدم کو، ہے یاروں کا قافلہ جاتا

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں، صیاد — میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں، صیاد
اُجاڑا موسمِ گل ہی میں آشیاں میرا — الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد
اُداس دیکھ کے مجھکو، چمن دکھاتا ہے — کئی برس میں ہوا ہے مزاج داں صیاد
دکھایا کنجِ قفس مجھ کو آب و دانہ نے — وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد
الٰہی دیکھئے کیونکر نباہ ہوتا ہے — زباں دراز ہوں میں، اور بدزباں صیاد
پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے — قفس کو لیکے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد

قفس پہ رکھنے لگا اب تو ہار پھولوں کے ہزار شکر ہوا مجھ پہ مہرباں صیاد

فریبِ دانہ نہ کھانا ہیں زینہار اسے دلِ

نہ کرنا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

صبا

(۱۷۹۳ء تا ۱۸۵۵ء)

میر وزیر علی، لکھنؤ کے باشندے اور خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔ ان کے دیوان میں اس زمانہ کے مروّج انداز کی غزلوں کے ساتھ ساتھ بہت سے اشعار آتش کے رنگ میں پائے جاتے ہیں اور جو غزلیں اس انداز کی ہیں وہ نہایت خوب ہیں۔

لوٹ ہیں صحنِ چمن پر بادہ خوار ابکی برس
خُوب سبزہ ہے کنارِ جوئبار ابکی برس

قدرتِ حق ہے تماشائے بہار ابکی برس
اے جُنوں کس رنگ پر ہے لالہ زار ابکی برس

سَرو بھی دبنے لگے شمشاد بھی دبنے لگے
باڑھ پر آیا جو نخلِ قدِ یار ابکی برس

ٹوٹ جاتی ہیں گُلوں کے بار سے سب ڈالیاں
پھوٹ پڑی ہے باغ میں کیسی بہار اب کی برس

اے صبا جب سے ابھی تک ہی خزاں کا دور دور
آئے گی بھی یا نہ آئے گی بہار اب کی برس

نکلیں کہیں احاطۂ وہم و گُماں سے ہم
باز آئے اس زمین سے اس آسماں سے ہم

ہرگز سما سکیں گے نہ میدانِ حشر میں
اتنے گناہ لیکے چلے ہیں جہاں سے ہم

گلشن بھی ہے، شراب بھی ہی، ابرِ تر بھی ہی
یادش بخیر، یار کو لائیں کہاں سے ہم

راہِ عدم میں نامۂ اعمال ساتھ ہے
کیسا یہ داغ لیکے چلے ہیں یہاں سے ہم

باقی رہے نہ فرق زمیں آسمان میں
اپنا قدم اٹھالیں اگر درمیاں سے ہم

یارانِ رفتگاں کیلئے خاک اڑاتے ہیں
پیچھے پڑے ہیں گردشِ کارواں سے ہم

یارب وُہ دورِ مے ہو کہ واعظ بھی یہ کہیں
باہر نہیں ہیں بیعتِ پیرِ مغاں سے ہم

فصلِ خزاں چمن میں جو آئی تو اے صبا
روئے لپٹ لپٹ کے بہت باغباں سے ہم

جو عدوئے باغ ہو برباد ہو — کوئی ہو، گلچیں ہو یا صیاد ہو

قیدِ مذہب واقعی اک روگ ہے — آدمی کو چاہیئے آزاد ہو

دور دورِ محتسب ہے ساقیا — ہائے کیوں کر میکدہ آباد ہو

میں وہ بلبل ہوں جسے دونوں ہیں ایک — باغ ہو یا خانۂ صیاد ہو

کیا قیامت ہے بُرا ہو موت کا — ہم نہ ہوں، یہ عالمِ ایجاد ہو

ظاہر و باطن میں اے دل فرق ہو — بُت بغل میں ہو خدا کی یاد ہو

خوب ہی اس گل کو لائے راہ پر
اے صبا تم بھی بڑے اُستاد ہو

رہنے والے تھے یہ نادان کہ جانے والے — خاک سمجھے نہ مکانوں کو بنانے والے

مر گئے عاشق نالاں تو کہا اُس بُت نے — سو گئے فتنۂ محشر کو جگانے والے

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے — خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

اے صبا حشر کو ہم رند یہ کہتے اُٹھے
المدد ساغرِ کوثر کے پلانے والے

نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے
جنُوں کا جوش ہے، فصلِ بہار باقی ہے
تپِ فراق سے بچ جائیں گے تو جانیں گے
کچھ اور زندگیِ مستعار باقی ہے
نہ پھُول عمرِ دو روزہ پہ اس قدر اے گُل
کوئی دن اور یہ فصلِ بہار باقی ہے
جہادِ نفس بھی ہے اے صبا تمہیں درپیش
بڑا ہی معرکۂ کارزار باقی ہے

نسیمؔ (دیاشنکر)

(۱۸۱۲ء ؁ ۱۸۴۴ء)

پنڈت دیاشنکر کول۔ ایک معزّز کشمیری خاندان سے تھے۔ فارسی اور اردو کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ شاعری میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے۔

ان کی مشہور تصنیف "مثنوی گلزار نسیم" اپنے زمانہ کے مخصوص رنگ میں استعارے، تشبیہات اور خوبصورت مناسبات لفظی سے مزیّن، نہایت دل آویز ہے۔ اکثر اس کا مقابلہ مثنوی میر حسنؔ سے کیا جاتا ہے۔ لیکن دونوں کا رنگ بالکل علیحدہ ہے، اس لئے مقابلہ عبث ہے۔

عشق میں دل بن کے دیوانہ چلا　　آشنا سے ہو کے بیگانہ چلا
قُلقُلِ مینا سے آتی ہے صدا　　بھر چکا جس وقت پیمانہ چلا
شب جو آیا بزم میں وُہ شعلہ رو　　شمع گُل کرنے کو پروانہ چلا
بوئے گُل غنچہ سے کہتی ہے نسیم
بات نکلی منہ سے، افسانہ چلا

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی　　کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی
جب ملے دو دل، مخل پھر کون ہے　　بیٹھ جاؤ، خود حیا اُٹھ جائے گی
گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا　　شاخ گُل اک روز جھونکا کھائے گی
داغِ سودا ایک دن دے گا بہار　　فصل اس گُل کی شگوفہ لائے گی
کچھ تو ہوگا ہجر میں انجام کار　　بے قراری کچھ نہ کچھ ٹھہرائے گی
صندلی رنگوں سے مانا دل ملا　　دردِ سر کی کس کے ماتھے جائے گی

خاکساروں سے جو رکھے گا غبار
اے فلک، بدلی تری ہو جائے گی

جب کرے گا گریباں، وہ شعلہ رُو
شمعِ محفل دیکھ کر جل جائے گی

جاں نکل جائے گی تن سے، اے نسیمؔ
گُل کو بوئے گُل ہوا بتلائے گی

خُم نہ بن کر خود غرض بن جائیے
مثلِ ساغر اور کے کام آئیے

ابرِ رحمت سنتے ہیں نام آپ کا
خاکساروں پر کرم فرمائیے

آپ آہو چشم ہیں، آہو نہیں
ہم سے وحشت کی نہ لیجے، آئیے

جوہرِ تیغِ نگہ کھُل جائے گا
مُنھ نہ میرے زخم کا کھلوائیے

سرد آہیں بھرتے ہیں جب ہم نسیمؔ
کہتے ہیں وہ ٹھنڈے ٹھنڈے جائیے

کیا ملا عرضِ مدّعا کر کے
بات بھی کھوئی التجا کر کے

لائے اس بُت کو التجا کر کے
کُفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

اب تو جاتے ہیں اُس گلی میں نسیم
ہو رہے گا جو کچھ مقدّر ہے

پہونچی نہ راحت ہم سے کسی کو اور اذیّت کوش ہوئے
جان پڑی تب بارِ شکم تھے، مر کے وبالِ دوش ہوئے

نسیمؔ (دہلوی)

(۱۷۹۴ء تا ۱۸۶۴ء)

مرزا اصغر علی خاں، دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ اور مومنؔ کی شاگردی میں فنّ شاعری میں دستگاہ پیدا کی۔ لیکن آخر لکھنؤ چلے گئے۔ جہاں ان کا کلام بہت مقبول ہوا۔ لیکن ان کو ہمیشہ اپنے دہلوی ہونے پر ناز رہا اور لکھنؤ کے اُس زمانہ کے طرز سے علیحدہ رہے۔ زبان نہایت شستہ، خیالات پاکیزہ، اور طرزِ ادا میں مومنؔ کا رنگ نظر آتا ہے۔ شاگردوں میں تسلیمؔ، قہرؔ اور اشرفؔ مشہور ہوئے۔

یہاں تک طول تھا، اے ہم نفس، کل ہجر کی شب میں
دعائیں جاگ کر سو سو رہیں، آغوشِ مطلب میں

ہمیں حضرت سلامت کہکے، صلواتیں سناتے ہیں
غضب کی شوخیاں ہیں اُن کے دشنامِ مؤدّب میں

مرے اشکوں کے قطرے ہیں جنھیں شبنم سمجھتے ہو
ٹپکتا ہے زُلالِ اشک، چھن کر دامنِ شب میں

لئے انکارِ ساقی نے ہزاروں خون گردن پر
نگاہیں ڈوب کر رہ گئیں جامِ لبالب میں

بلندی پر ہے اقبالِ محبت خاکساروں کا
شرارِ آہ خوابیدہ ہوئے پہلوئے کوکب میں

نسیمؔ اس بے وفا سے حالِ دل کہنا نہیں اچھا
جلی ہوں گے، مضامینِ خفی اظہارِ مطلب میں

کرشمے، غمزے سب، او فتنۂ عالم سمجھتے ہیں

ترے ابروئے پیوستہ کے تیور، ہم سمجھتے ہیں

ڈراتا کس کو ہے واعظ عذابِ روزِ محشر سے

قیامت اک خیالِ کاکلِ برہم سمجھتے ہیں

نسیمِ دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں

کوئی اردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

—— ※ ——

سفر ہے دشوار، خواب کب تک، بہت بڑی منزلِ عدم ہے

نسیم جاگو، کمر کو باندھو، اٹھاؤ بستر، کہ رات کم ہے

جوانی و حسن و جاہ و دولت، یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے

اجل ہے استادہ دست بستہ، نویدِ رخصت ہر ایک دم ہے

نسیم غفلت کی چل رہی ہے، اُمنڈ رہی ہیں قضا کی نیندیں

کچھ ایسا سوئے ہیں سونے والے، کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

بسانِ دستِ سوالِ سائل، تہی ہوں ہر ایک مُدّعا سے
نیاز ہے بے نیازیوں سے، بغل میں دل صورتِ صنم ہے

مآل کارِ جہانِ فانی، کبھی نہیں ایک قاعدے پر
جو چار دن ہے وفورِ راحت، تو بعد اس کے غم و الم ہے

زبان روکو، بہک رہے ہو، سرورِ دوشینہ جوش پر ہے
مئے وصالِ شبِ تمنّا ہر ایک لب سے ابھی بہم ہے

یہ مصرعِ مخبرِ مصیبت پسند ہم کو کمال آیا
تسنیم جاگو، کمر کو باندھو، اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

فصلِ گل آئی ہے کل اور ہی ساماں ہونگے
میرے دامن میں مرے جیب و گریباں ہونگے

سب یہ کافر ہیں حسینوں کی نہ سُن تو اے دل
چار دن بعد یہی دشمنِ ایماں ہونگے

شکر ہو جائیں گے انجام کو اپنے شکوے
رنج کے خوف سے ہم ان کے ثناخواں ہونگے

کس طرح جائیں گے مانع ہے ہمیں ضعفِ مزاج   زلف پرخم ہے تو کچھ وہ بھی پریشاں ہونگے

شوخیاں کرے جنوں آج یہاں پر کل تو   خاک اُڑائیگی زمیں، دشت یہ ویراں ہونگے

یاد آئے گا پسِ مرگ، ہمارا یہ کمال   حال کھل جائیگا جب خاک میں پنہاں ہونگے

گردِ ہر نخل پھریں گے صفتِ گردِ نسیم
ہم پسِ مرگ بھی قربانِ گلستاں ہونگے

قلق

(۰۰۰۰۰ تا ۱۸۸۰ء)

خواجہ ارشد علی خاں، واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے مصاحبین میں سے تھے۔ دربار سے نواب آفتاب الدولہ کا خطاب ملا۔ خواجہ وزیر کے شاگرد تھے۔ کلام میں بھی انہیں کا رنگ نظر آتا ہے۔ اِن کی غزلیں لکھنؤ کے آخری دور کی شاعری کا نمونہ ہیں۔ ایک مثنوی "طلسمِ اُلفت" بہت مشہور ہوئی۔

بس اِک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا　　ادا سے دیکھ لو، جاتا رہے گلہ دِل کا

ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا　　بہار آتے ہی کُنجِ قفس نصیب ہوا

الٰہی خیر ہو کچھ آج رنگ بے ڈھب ہے — ٹپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دِل کا
چلا ہے چھوڑ کے تنہا کدھر تصوّرِ یار — شبِ فراق ہیں تھا تجھ سے مشغلہ دِل کا
وُہ رند ہوں کہ مجھے ہتکڑی سی بیعت ہی — ملا ہے گیسوئے جاناں سی سلسلہ دِل کا
پھرا جو کوچۂ قاتل سے کوئی، پوچھیں گے — سُنا ہے لُٹ گیا رستہ میں قافلہ دِل کا
وُہ ظلم کرتے ہیں ہم پر تو لوگ کہتے ہیں — خدا بُرے سے نہ ڈالے معاملہ دِل کا
ہزار فصلِ گل آئے مگر، وُہ جوش کہاں — گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دِل کا

خدا کے ہاتھ ہے اپنا اب اے فلق انصاف
بتوں سے حشر میں ہوگا معاملہ دل کا

بہارِ عیش ہوتی ہے خزاں، پیری ہے آنے کو
جوانی روٹھی جاتی ہے کہیں کس سے منانے کو
عجب انصاف تیرے دور میں اے آسماں دیکھا
زمانہ چین کرتا ہے، ہیں ہم ایذا اُٹھانے کو

فلَق باہر نہ جاتی بوئے گل گلزار سے ہرگز
اثر سے کچھ بھی مس ہوتا جو بلبل کے ترانے کو

قد ترا دیکھ کے طوبیٰ کو بھی ہم بھول گئے
روبروِ رُخ کے گلِ باغِ ارم بھول گئے

یاد دلوائیے ان کو جو کبھی وعدۂ وصل
تو وُہ کس ناز سے فرماتے ہیں، ہم بھول گئے

کبھی سرسبز مرا نخلِ تمنّا نہ ہوا
کِشتِ اُمید مری ابرِ کرم بھول گئے

یادِ عشاق کریں کیا یہ تغافل پیشہ
بندے تو بندے، خدا کو بہ صنم بھول گئے

پھر فریبندہ ملاقات کا دم بھرنے لگے
کیا تمہیں اس ستم ایجاد کے دم بھول گئے

حضرتِ عشق نے دونوں کو کیا خانہ خراب
برہمن بتکدہ، اور شیخ حرم بھول گئے

عشق میں تیرے، جانِ زار، حیف ہے مفت میں چلی
تو نے پر او ستم شعار، اب بھی مری خبر نہ لی

کوئی بلا پھر آئے گی، مفت میں جان جائے گی

پیچ میں ہم کو لائے گی، زلفِ سیاہ بڑھ چلی

آتے ہی فصلِ دلپذیر، روئے قفس میں ہمصفیر

جس میں ہوئے تھے ہم اسیر، لو وہی پھر ہوا چلی

اے گلِ گلشنِ وفا، بے ترے نیند آئے کیا

بسترِ خار سے سوا، ہے مجھے فرشِ مخملی

دانش و طاقت و بصر، بڑھ گئے سارے ہم سفر

زادِ سفر کی فکر کر، لگ رہی ہے چلا چلی

مبتلائے ستم و حسرت و آلام رہے
شاد دو دن بھی نہ ہم اے غمِ ایام رہے

ساقیا ایک ہمیں ملتجئی جام رہے
مست دورے میں ترے خاص سے تا عام رہے

رہ گئے حسن و محبت کے جہاں میں چرچے
پر نہ ہم تم وہ رہے اور نہ وہ ہنگام رہے

چین سے ایک گھڑی بزمِ جہاں میں نہ کٹی — خلل اندازِ طرب حسرت و آلام رہے
کیونکہ اے راحتِ جاں دل کو مرے چین آئے — جبکہ پہلو سے جدا تجھ سا دل آرام رہے
بعدِ مردن بھی فلک درپئے آزار رہا — ہم تہِ خاک بھی اک دن نہ بآرام رہے
دل کو خواہش نہ ہو کچھ اور بجز بادۂ شوق — نشۂ اُلفتِ ساقیِ گل اندام رہے

مرتے[۱] دم دعوئِ اسلام ہے سبحان اللہ
زندگی بھر تو فلق بندۂ اصنام رہے

⁂

---

۱ عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے (مومن)

اَمانت

(۱۸۱۶ء ؁ ۱۸۵۹ء)

سیّد آغا حسن، لکھنؤ کے باشندے تھے۔ ابتدا میں دلگیر مرثیہ گو سے اصلاح لیتے تھے۔ غزل گوئی میں انہماک زیادہ پیدا ہوا۔ تو استاد سے علیحدہ ہو گئے۔ اَمانت کی شاعری زیادہ تر مناسباتِ لفظی کے لئے مشہور ہے۔ ان کی تصنیف "اندر سبھا" زبانِ اردو کا پہلا ڈراما ہے۔ ایک عرصہ تک ہندوستان کی تھیٹر کمپنیاں اس ڈرامے کو کرتی رہیں۔ غزلوں کے علاوہ اَمانت کا واسوخت بھی کافی مقبول ہوا۔ لیکن ان کی شہرت سب سے زیادہ اردو زبان کے پہلے ڈراما نویس کی حیثیت سے ہے۔

دل مرا اسیرِ چمن سے نہ ہوا شاد کبھی
لے گیا باغ میں بھولے سے نہ صیاد کبھی

تم وُہ خوش قد ہو، روش پر جو ذرا تنکے چلو
سر اُٹھلائے نہ چمن میں کوئی شمشاد کبھی

دل کو تھا عالمِ طفلی میں یہ شوق صحرا
نہ کیا میں نے گلستان کا سبق یاد کبھی

صورتِ نقشِ قدم ہم نے گذاری اوقات
مٹ گئے صاف کبھی، ہو گئے برباد کبھی

بُلبلو کس کو دکھاتی ہو عروجِ پرواز
ہم بھی اس باغ میں تھے سروسے آزاد کبھی

※

دل کو مرغوب ہے، ٹھنڈی جو ہوا ساون کی
مانگتا ہوں میں سدا حق سے دعا ساون کی

یاد آتا ہے وُہ سبزہ وُہ گھٹا ساون کی
شکل دکھلائے کہیں جلد خدا ساون کی

ہجر ساقی میں رُلاتا ہے مجھے ابرِ سیاہ
غم و اندوہ بڑھاتی ہے گھٹا ساون کی

کیوں شبِ ہجر تصور نہ مجھے زلف کا ہو
رات ہوتی ہے سیاہی ہیں بلا ساون کی

اے امانت یہ نکالی ہے زمیں تونے نئی
پہلے تھی کس کی غزل تیرے سوا ساون کی

آختر (واجد علی شاہ)

(۱۸۲۷ء ؁ ۱۸۸۷ء)

سلطانِ عالم، واجد علی شاہ، حکومت اودھ کے آخری تاجدار، دوسرے فنونِ لطیفہ کے ساتھ شعروشاعری سے بھی ذوق رکھتے تھے، اور اہلِ کمال کے قدردان تھے پہلے اسیر اور پھر برق سے اصلاح لیتے تھے۔ چھ دیوان اور چند مجموعے قصائد مثنویات اور مراثی کے ان کی یادگار ہیں۔ ان کے علاوہ کئی کتابیں عروض وقافیہ موسیقی، اور علمی و مذہبی مسائل پر تصنیف کیں۔

افسوس ہے کہ اپنی غفلت اور زمانہ کے حالات کی وجہ سے ان کی حکومت

بہت جلد ختم ہو گئی۔ ۱۸۵۶ء میں معزولی کے بعد کلکتہ بھیج دئے گئے اور وہیں ٹٹیا برج میں باقی زندگی انگریزی حکومت کی نگرانی میں، لیکن بہ کمال عیش و عشرت گذار کے ۱۸۸۷ء میں انتقال کیا۔

جگرِ عاشقِ دل سوز جلاتے نہ چلو　　　شمع کو محفلِ عشرت میں رلاتے نہ چلو
دردنداں سی تو شبنم کو رلاتے نہ چلو　　　غنچۂ بند کو گلشن میں ہنساتے نہ چلو
سمِ رہوار سے مردوں کو جلاتے نہ چلو　　　سوتے فتنہ کو تم اے ماہ جگاتے نہ چلو

باغ میں آتے ہو گل رو تو ذرا بلبل کو
غزلِ اخترِ خوش لہجہ سناتے نہ چلو

بندہ کو اس کے عشق ہے ذات و صفات کا
شیدا حقیقتاً ہے وہ اس کائنات کا
اعجازِ عیسوی جو لبوں سے دکھا دیا
ہر تارِ زلف کیوں نہ ہو رشتہ حیات کا

ہر صفحہ دردِ دل سے سیہ رنگ ہو گیا
دھوکا ہے صبح کو مرے دیوان پہ رات کا

ناقوسِ برہمن سے صدائے اذاں سُنی
مسجد سے مجھ کو قصد ہوا سومنات کا

عاصی ہیں ہم، غفور ہے وُہ مالکِ جہاں
اختر کو آسرا ہے فقط اس کی ذات کا

عشق کا حرف کبھی منہ سے سُنایا نہ گیا
جگرِ عاشقِ دل سوز جلایا نہ گیا

ٹھوکریں کھاتا، بھلا سامنے کیونکر آتا
پاؤں شل کبک کے تھے راہ میں آیا نہ گیا

خوابِ خرگوش سی غفلت میں پڑے ہیں یہ رقیب
بختِ بیدار کو عاشق کے سُلایا نہ گیا

کوچۂ یار میں ڈھونڈھا بہت اختر میں نے
ایسا کھویا گیا دل میرا کہ پایا نہ گیا

بہت لاؤ بالی کٹی ہے جوانی ضعیفی میں کچھ کچھ تو خیر العمل کر

جسے دیکھا اُس کو خزاں ایک دِن ہے نہ پھل پایا کچھ باغ عالم میں پھل کر

ابھی سرو کی راستی میں خم آئے جو تو گیسوؤں کی طرح اس سے بل کر

علیؑ تو مدد آخترِ زار کی کر

جو مشکل ہے حلّالِ مشکل تو حل کر

دربارِ اودھ کے دیگر شعراء

برقؔ : محمد رضا، واجد علی شاہ اختؔر کے خاص مصاحبین میں سے تھے۔ اُن کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں انتقال کیا۔

نکلا غبار دل سے صفائی تو ہو گئی　　اچھا ہُوا جو خاک میں تم نے مِلا دیا

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکارا آیا

دل شگفتہ ہو تو سب عیشِ جہاں مٹّی ہے
تو نہیں پاس تو پھر لطفِ چمن خاک نہیں

شکوہ میں نے جو کیا، جائے شکایت یہ نہیں
جس سے ہوتی ہے امید اس سے گِلا ہوتا ہے

رشک: میر علی اوسط، اپنے اُستاد ناسخ کی طرح انہوں نے بھی زبان کی اصلاح میں نمایاں حصّہ لیا اور ایک لُغت جس کا تاریخی نام "نفس اللّغتہ" ہے تالیف کیا۔ کلام اپنے زمانہ کے مخصوص رنگ میں۔

محفل میں شمع، چاند فلک پر چمن میں پھول
تصویرِ روئے انورِ جاناں کہاں نہیں

اس فہم پر حقیقتِ جاناں کی فکر ہے　　واقف نہیں ہم اپنی حقیقت سے آج تک

بحرؔ: شیخ امداد علی، لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ کچھ دنوں رامپور میں نواب کلب علی خاں کے زیر سایہ بسر کی لیکن آخر عمر لکھنؤ واپس آ گئے۔ اور وہیں زندگی گذاری ان کو بھی زبان کی تحقیق سے کافی دلچسپی تھی۔ زندگی ناکامی و نامرادی میں بسر کی اور اکثر کلام میں ان حالات کا رنگ جھلکتا ہے۔

نہ تو وُہ پھول، نہ کلیاں، نہ وُہ سبزہ نہ بہار
رُت کے پھرتے ہی چمن زار کا تختہ اُلٹا

ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ — اتنا بھی دِل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

×

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں — دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

×

آسائشِ بیجا سے مسرت نہیں ہوتی — سو جائیں اگر پاؤں تو راحت نہیں ہوتی

×

کٹی برسات پھر اس سال بھی فریاد و شیون میں
خبر ہم کو نہیں بادل کدھر آئے کدھر برسے

گویا (۱۷۸۰ء-۱۸۸۴ء): نوابِ فقیر محمد خاں، دربارِ اودھ کے مشہور شاعر تھے۔ لیکن بعض اوقات ان کی خوبصورت فارسی ترکیبیں مومن کی یاد دلاتی ہیں۔ ان کی یہ مسلسل غزل مشہور رہی ہے۔

پھر یہ دل شیفتۂ زلفِ پریشاں ہوگا — پھر مرا جوشِ جنوں سلسلہ جنباں ہوگا
اے جنوں پھر مجھے خوش آنے لگی عریانی — پھر نہ دامن ہی رہے گا نہ گریباں ہوگا
پھر لگی لالہ رخوں سے مجھے الفت ہونے — سینہ پھر داغوں سے مانندِ گلستاں ہوگا

کہیں کہیں اس زمانہ کا لکھنؤ کا رنگ صاف جھلکتا ہے ؎

باتوں ہی باتوں قاتل بے موت مارتے ہیں
شمشیر کی زباں سے مجھکو پکارتے ہیں
بجلی چمک رہی ہے کالی گھٹا ہے چھائی
ہنس ہنس کے کیا وہ اپنی زلفیں سنوارتے ہیں

تعشق: مرزا انس کے صاحبزادے تھے اور عشق کے بھائی۔ ناسخ سے اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ کے اُس زمانہ کے مشہور غزل گو شعرا میں تھے۔ زبان کی شیرینی کے ساتھ کلام میں سوز و گداز پایا جاتا ہے ؎

دل ہے مردہ خلد میں جانے سے کیا ہو جائے گا
ہم جہاں ہوں گے وُہ گھر ماتم سرا ہو جائے گا

آفتابِ داغِ دل کا سامنا اچھا نہیں
سا نولا رنگ آپ کا اے مہ لقا ہو جائے گا

تم نہ روکو گے تو ہو گا بحرِ ہستی میں تباہ
دل ہمارا کشتیِ بے ناخدا ہو جائے گا

کچھ نہ کچھ گورِ غریباں پر بھی ساماں ہو گیا
چار تارے چرخ سے ٹوٹے، چراغاں ہو گیا

دل ہمارا اک مرقع تھا، پریشاں ہو گیا
نام گل رویوں کی بستی کا بیاباں ہو گیا
کہتی ہے دوشِ صبا پر شمع و پروانہ کی خاک
جلد حسن و عشق کا دفتر پریشاں ہو گیا

اے آسماں معاف رکھ ان صحبتوں سے اب
شادی کے کام کا دلِ اندوہ گیں نہیں
میں زاہدوں کے سامنے ہوں تارک الصّلوٰۃ
کس سے کہوں کہ لائق سجدہ جبیں نہیں

تمام گردِ کدورت ہے قالبِ خاکی
عدم سے قلب پہ ہم لیکے یہ غبار آئے

باب ہشتم، دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا آخری دور

(انیسویں صدی کا آخر)

ہنگامۂ غدر کے بعد دہلی اور لکھنؤ کے اکثر شعرا نے رامپور اور حیدرآباد کا رخ کیا جہاں شعر و سخن کے قدردان موجود تھے۔ ان میں سب سے ممتاز داغ اور امیر مینائی تھے جن کے شاگردوں کی بدولت ایک مدت تک پرانی روایاتی شاعری کے چراغ ہندوستان بھر میں روشن رہے۔ داغ، ذوق کے شاگرد تھے۔ اور امیر مینائی اسیر کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے لکھنؤ کی یادگار سمجھے جاتے تھے۔ اگرچہ داغ کے

یہاں طنز، شوخی اور لطفِ زبان زیادہ ہے۔ لیکن دونوں کے رنگ میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ غالب، مومن اور ذوق کے دوسرے شاگردوں مثلاً سالک، مجروح اور ظہیر کے کلام میں بھی معاملہ بندی کے اشعار بکثرت ملتے ہیں۔ اس طرح دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا فرق مٹ گیا۔ البتہ مولانا حالی اور محمد حسین آزاد نے نئے رجحانات کے زیرِ اثر سادگیِ بیان اور حقیقی جذبات کی طرف توجہ دلائی۔ انگریزی نظموں کے ترجمے شائع کئے اور تاریخی اور اخلاقی نظمیں لکھیں۔ اگرچہ اُس وقت یہ طرز فروغ نہ پایا، لیکن بیسویں صدی کے شعرا پر ان کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

⁂

امیر

(۱۸۲۸ء ⁂ ۱۹۰۱ء)

منشی امیر احمد۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ درسیات علمائے فرنگی محل سے پڑھیں۔ شاعری میں میر مظفر علی اسیر کے شاگرد ہوئے۔

امیر مینائی نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ دربار رام پور میں گذارا۔ جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ آخر عمر میں حیدرآباد گئے اور وہیں انتقال کیا۔

شاعری کے علاوہ امیر مینائی کو زبان کی تحقیقات سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کی مشہور تصنیف "امیر اللغات" افسوس ہے نامکمل رہ گئی۔ قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کو

اپنے زمانہ کا مصحفی کہہ سکتے ہیں۔ ہر رنگ میں اور ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت بڑی ہے، جن میں جلیل، ریاض خیرآبادی، محسن کاکوروی اور مضطر مشہور رہوئے۔

نہ کورِ باطن ہوا سے برہمن، ذرا تو چشمِ تمیز وا کر
خدا کا بندہ، بتوں کو سجدہ، خدا خدا کر، خدا خدا کر
قدم کو لغزش، زباں کو لکنت، ہے رعشہ ہاتھوں کو سر کو جنبش
کدھر گئی ہائے نوجوانی، ان آفتوں میں ہمیں پھنسا کر
جو آنکھ کھولی تو کچھ نہ دیکھا، سحر کو سنسان سب سرا تھی
ہوا نہ ہمراہیوں سے اتنا کہ، ساتھ لیتے مجھے جگا کر
شبیہہ مدِ نظر ہے کس کی کہ پوری پوری نہیں اترتی
مٹا دئے صانعِ ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

رہے تصویر حیرانی ہم اُن کے روبرو برسوں
لبِ خاموش سے کی دردِ دل کی گفتگو برسوں

نہ کر اے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

نہیں اے بیکسی، بعد فنا کچھ خوفِ تنہائی
رہے گا میری تربت پر ہجومِ آرزو برسوں

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں
رہیگا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

ہم ہیں وہ اے کلیم کہ غش کا تو ذکر کیا
جھپکی نہ آنکھ برق جمالوں کے سامنے

دنیا امیر کیا ہے جو ماتم کدہ نہیں
ہر دم یہاں ہیں تازہ ملالوں کے سامنے

سب کرشمے تھے جوانی کے، جوانی کیا گئی
وہ اُمنگیں مٹ گئیں، وہ ولولہ جاتا رہا

آنے والا جانے والا بیکسی میں کون تھا
ہاں مگر اک دم غریب آتا رہا جاتا رہا

آنکھ کیا ہے، موہنی ہے، سحر ہے، اعجاز ہے
اک نگاہِ لطف میں سارا گلہ جاتا رہا

کھو گیا دل کھو گیا، رہتا تو کیا ہوتا امیرؔ
جانے دو اک بیوفا جاتا رہا، جاتا رہا

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سر مزار ہوں میں
نگاہِ گرم سے مجھکو نہ دیکھ اے دوزخ!
خبر نہیں تجھے کس کا گناہگار ہوں میں
پھر اُس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہگار یہ کہدے گناہگار ہوں میں

حضور! وصل کی حسرت ازل سے ہے مجھ کو
خیال کیجئے کب سے اُمیدوار ہوں میں
بڑے مزے سے گذرتی ہے بیخودی میں امیرؔ
خدا وُہ دن نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

آنکھ اُس کے حضور رو رہی ہے — ساتھ اپنے مجھے ڈبو رہی ہے
دیدار کہاں کہ دُور ہے حشر — قسمت ابھی اپنی سو رہی ہے
کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم — جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے
کیا کشتی و ناخدا کا شکوہ — تقدیر ہمیں ڈبو رہی ہے
نرگس کو صبا نہ چھیڑ اتنا — سونے دے غریب سو رہی ہے
گلشن میں جو ابر ہے دُھواں دھار — میخواروں میں دھوم ہو رہی ہے
ہم جاگ رہے ہیں ہجر کی شب — تقدیر ہماری سو رہی ہے

احساں ہے آمیر چشم تر کا
نامے کی سیاہی دھو رہی ہے

میری تربت پر اگر آئیے گا　　عمرِ رفتہ کو بھی بلوائیے گا
سب کی نظروں پہ نہ چڑھئے اتنا　　دیکھئے دل سے اتر جائیے گا
زرق برق آپ کی بے وجہ نہیں　　درد دل کو مرے چمکائیے گا

جس طرح عمر گذرتی ہے آمیر
آپ بھی یونہیں گذر جائیے گا

میں جاگ رہا ہوں اے شب غم　　پر میرے نصیب سو رہے ہیں
دل چھین کے ہو گئے ہیں غافل　　فتنے وُہ جگا کے سو رہے ہیں
محفل برخاست ہے، پتنگے　ق　رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں

ہے کوچ کا وقت، آسماں پر تارے کہیں نام کو رہے ہیں
اِن کی بھی نمود ہے کوئی دم وُہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ رنگ، اور ہم کو کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں
زانو پہ امیرؔ سر کو رکھے
پہروں گذرے کہ رو رہے ہیں

ضبط کرنا دلِ حزیں نہ کہیں چوٹ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں
مسکرا کر وُہ شوخ کہتا ہے آج بجلی گری کہیں نہ کہیں
حوریں لپٹی ہیں نزع میں مجھ سے دیکھ پائے وُہ نازنیں نہ کہیں
دل سی شئے لے کے اب تو نکلے ہیں پوچھ لے گا کوئی کہیں نہ کہیں
آگ ہو جائے گا وُہ شوخ امیرؔ
کھینچنا آہِ آتشیں نہ کہیں

عالم شگفتہ ہو جو بیں آفت رسیدہ ہوں
صبحِ بہار ہو، جو گریباں دریدہ ہوں

میرے صفائے دِل نے جو کھولے ہیں میرے عیب
شرمندہ مثل زنگیٔ آئینہ دیدہ ہوں

اے اہلِ بزم مجھکو اُٹھاؤ نہ بزم سے
شمعِ سحر ہوں، عمر بہ پایاں رسیدہ ہوں

مطلب خزاں سے کچھ نہ غرض ہے بہار سے
دونوں سے مثل سرو میں دامن کشیدہ ہوں

شبنم کے اے امیر ملے ہیں مجھے نصیب
گل ہنس پڑیں چمن میں جو میں آبدیدہ ہوں

*

آنکھ اُس کو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے
چلئے چمن میں نرگس بیمار ہو گئی ہے

انگور میں تھی یہ مے، پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے، تلوار ہو گئی ہے

قیامت کا اگر ڈر ہے تو یہ ہے — کہ ہے ہے ہم کو پھر جینا پڑیگا

اُس بُتِ تند خو کو رام کیا — آفریں، اے امیرؔ، کام کیا

قریب ہے یار روزِ محشر، چھپیگا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

ہے آج جو سرگذشت اپنی — کل اُس کی کہانیاں بنیں گی

پھولوں میں اگر ہے بو، تمہاری
کانٹوں میں بھی ہو گی خو، تمہاری

داغ

(۱۸۳۱ء ÷ ۱۹۰۵ء)

نواب مرزا خاں، دہلی میں پیدا ہوئے۔ نواب لوہارو کے خاندان سے تھے
والد کے انتقال کے بعد ان کی ماں نے شاہزادہ مرزا فخرو کے ساتھ شادی کر لی
اور اُن کے ساتھ یہ بھی محلِ شاہی میں رہنے لگے۔ زبان کی چاشنی جس پر داغ کو
ہمیشہ فخر رہا بہت کچھ قلعۂ معلّیٰ کا فیض تھی ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہد د
کہ آئے گی اردو زباں آتے آتے

داغ ایک عرصہ تک دربار رام پور میں رہے۔ آخر عمر حیدر آباد میں گذاری اکثر شعرا کی نسبت داغ نے بڑی فراغت سے بسر کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی شوخیٔ طبع، لطیفہ سنجی اور کلام کی شیرینی ان کو ہر جگہ ہر دلعزیز بنا دیتی تھی۔ داغ کی شاعری میں شوخی اور شرارت پائی جاتی ہے۔ عاشقانہ مضامین بڑے دلفریب انداز سے پیش کئے ہیں۔ کہیں کہیں تصوّف کے مضامین بھی سادگی اور خوبصورتی سے نباہے ہیں۔

داغ کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ جن میں حسن بریلوی، نسیم بھرت پوری، بیخود دہلوی، بیخود بدایونی، نوح ناروی، علامہ اقبال، سائل اور جگر مراد آبادی زیادہ مشہور ہوئے۔

دل کی بھی پروا نہیں، جاتا رہا جاتا رہا   تو ہی اپنے ہاتھ سے حیف دلربا جاتا رہا

جس توقع پر تھی اپنی زندگی وُہ مٹ گئی | جو بھروسا تھا ہمیں، وہ آسرا جاتا رہا
دل چرا کر آپ تو بیٹھے ہوئے ہیں چین سے | ڈھونڈنے والے سے پوچھے کوئی، کیا جاتا رہا
مرگ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھکو ملال | دشمنی کا لطف، شکووں کا مزا جاتا رہا
اچھی صورت کی رہا کرتی تھی اکثر تاک جھانک | رہ گئیں آنکھیں، مگر وُہ دیکھنا جاتا رہا
حرص دامنگیر دنیا، مال دنیا بے ثبات | جس قدر حاصل کیا اس سے سوا جاتا رہا
اب کئی دن سے وُہ رسم وراہ بھی موقوف ہے | ورنہ برسوں نامہ بر آتا رہا، جاتا رہا

داغ کچھ درہم نہ تھا جس کا انہیں ہوتا خیال
کھو گیا، گم ہو گیا، جاتا رہا، جاتا رہا

غیر کو منہ لگا کے دیکھ لیا | جھوٹ سچ آزما کے، دیکھ لیا
اُن کے گھر داغ، جا کے دیکھ لیا | دل کے کہنے میں آ کے، دیکھ لیا
کتنی فرحت فزا تھی بوئے وفا | اُس نے دل کو جلا کے دیکھ لیا

جاؤ بھی، کیا کروگے مہر و وفا | بارہا آزما کے دیکھ لیا
اُس نے صبحِ شبِ وصال مجھے | جاتے جاتے بھی آ کے دیکھ لیا
تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار | اور جو ہم نے آ کے دیکھ لیا

داغ نے خوب، عاشقی کا مزہ
جل کے دیکھا، جلا کے دیکھ لیا

جب جوانی کا مزہ جاتا رہا | زندگانی کا مزہ جاتا رہا[1]
داستانِ عشق جب ٹھہری غلط | پھر کہانی کا مزہ جاتا رہا
مِٹ گئی اب داغِ فرقت کی جلن | اس نشانی کا مزہ جاتا رہا
غیر پر لطف و کرم ہونے لگا | مہربانی کا مزہ جاتا رہا

---

[1] دریغا کہ روزِ جوانی گذشت | جوانی مگو زندگانی گذشت

داغ ہی کے دم سے تھا لطفِ سخن
خوش بیانی کا مزا جاتا رہا

وہ جانا پھیر کر چتون کسی کا
ہمارے ہاتھ میں دامن کسی کا
زمانے کے چلن سیکھے ہیں تو نے
کسی کا دوست ہے، دشمن کسی کا
دلِ ویراں کو جب دیکھا تو بولے
یہ ہے اُجڑا ہوا مسکن کسی کا
کلیجہ تھام لو گے جب سنو گے
نہ سنوائے خدا شیون کسی کا
گرے گی طور پر اک اور بجلی
چمکتا ہے رُخِ روشن کسی کا
وہ پھرروں دیکھتے ہیں داغ کے داغ
کسی کی سیر ہے گلشن کسی کا

گیا ہے عرشِ معلّٰی پہ شور نالوں کا
خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا

انھیں جو بحث قیامت سے ہے قیامت کی
عجیب حال دگرگوں ہے پائمالوں کا

فلک پہ شمس و قمر ہیں، زمیں پہ لالہ و گل
مگر جواب کہاں ہے تمہارے گالوں کا

ہر ایک مارسیہ، زلف و گیسو و کاکل
تمہارے بال ہیں یا کھیت ہے یہ کالوں کا

کہیں نہیں تری درگاہ کے سوا، یارب
فلک زدوں کا ٹھکانا، خراب حالوں کا

وُہ پھول والوں کا میلہ وُہ سیر یاد ہے داغ
وُہ زور جھرنے پہ جمگھٹ پری جمالوں کا

بُت کو بُت اور خدا کو جو خدا کہتے ہیں
ہم بھی دیکھیں تو اُسے دیکھ کے کیا کہتے ہیں

جو بھلے ہیں وُہ بروں کو بھی بھلا کہتے ہیں
نہ بُرا سنتے ہیں اچھے نہ بُرا کہتے ہیں

بزم احباب و مئے ناب و وصالِ معشوق
اب کسی شے میں نہیں، جس کو مزا کہتے ہیں

میں گنہگار، اگر عشقِ مجازی ہے گناہ
ہیں خطاوار، اگر اس کو خطا کہتے ہیں

کوئی خوبی نظر آتی نہیں تجھ میں ظالم
اے فلک، پیری و صد عیب بجا کہتے ہیں

نہیں ملتا کسی مضموں میں ہمارا مضموں طرز اپنا ہے جُدا، اپنا جُدا کہتے ہیں

پہلے تو داغ کی تعریف ہوا کرتی تھی
اب خدا جانے وُہ کیوں اس کو بُرا کہتے ہیں

بُتانِ ماہ وَش اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
کہ جس کی جان جاتی ہے اسی کے دل میں رہتے ہیں
ہزاروں داغ پنہاں عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں
شرر پتھّر کی صورت ان کی آب وگِل میں رہتے ہیں
زمیں پر پاؤں نخوت سے نہیں رکھتے پری پیکر
یہ گویا اس مکاں کی دوسری منزل میں رہتے ہیں
محبّت میں مزہ ہے چھیڑ کا، لیکن مزے کی ہو
ہزاروں لُطف ہر اک شکوۂ باطل میں رہتے ہیں

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ روکے سے نہیں رکتیں
بہت ارمان ایسے ہیں کہ دل کے دل میں رہتے ہیں

نہ دیکھے ہوں گے رندوں سے بھی تو نے پاک اے زاہد
کہ یہ بے داغ میخانے کی آب و گل میں رہتے ہیں

خدا رکھے محبت کو کئے آباد گھر دونوں
میں اُن کے دل میں رہتا ہوں وہ میرے دل میں رہتے ہیں

ہمارے سائے سے بچتا ہے ہر اک بزم میں اُن کی
ہمیں دیکھو کہ ہم تنہا بھری محفل میں رہتے ہیں

فلک دشمن ہوا، گردش زدوں کو جب ملی راحت
زیادہ راہ سے کھٹکے ہمیں منزل میں رہتے ہیں

تن آسانی کہاں تقدیر میں ہم دل گرفتوں کی
خدا پر خوب روشن ہے کہ جس مشکل میں رہتے ہیں

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا
تخلّص داغ ہے، اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

پردے پردے میں عتاب اچھے نہیں — ایسے انداز حجاب اچھے نہیں
صورت اچھی ہے، تو سیرت ہے بُری — ایسے معشوق، انتخاب اچھے نہیں
توبہ کر لیں ہم مے و معشوق سے — بے مزہ ہیں یہ ثواب اچھے نہیں

اک نجومی داغ سے کہتا تھا آج
آپ کے دن اے جناب اچھے نہیں

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں — اور کھُل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں
یارب اس چاند سے ٹکڑے کو کہاں سے لاؤں — روشنی جس کی ہو ان تاروں بھری راتوں میں
تمہیں انصاف سے اے حضرت ناصح کہدو — لطف ان باتوں میں آتا ہے کہ ان باتوں میں

اور سنئے ابھی رندوں سے جناب واعظ	چلدئے آپ تو دو چار ہی صلواتوں میں

وُہ گئے دن جو رہے یادِ بتوں کی، اے داغؔ
رات بھر اب تو گذرتی ہے مناجاتوں میں

بھنویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے، کہ وُہ یوں بن کے بیٹھے ہیں
الٰہی کیوں نہیں اُٹھتی قیامت، ماجرا کیا ہے؟
ہمارے سامنے، پہلو میں وُہ دشمن کے بیٹھے ہیں
یہ گستاخی یہ چھیڑ اچھی نہیں ہے، اے دلِ ناداں
ابھی پھر روٹھ جائیں گے، ابھی وُہ من کے بیٹھے ہیں
اثر ہے جذبِ اُلفت میں تو من کر آہی جائیں گے
ہمیں پروا نہیں ہم سے اگر وُہ تن کے بیٹھے ہیں

سُبک ہو جائیں گے گر جائیں گے وُہ بزمِ دشمن میں
کہ جب تک گھر میں بیٹھے ہیں وُہ لاکھوں من کے بیٹھے ہیں

بہت رویا ہوں میں، جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہائے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

نگاہِ شوخ و چشمِ شوق میں در پردہ چھنتی ہے
کہ وُہ چلمن میں ہیں، نزدیک ہم چلمن کے بیٹھے ہیں

قسم دے کر اُنہیں سے پوچھ لو تم رنگ ڈھنگ اُسکے
تمہاری بزم میں کچھ دوست بھی دشمن کے بیٹھے ہیں

کوئی چھینٹا پڑے تو داغؔ کلکتے چلے جائیں!
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

تمام رات وُہ جاگیں، وُہ سوئیں سارے دن　　　خبر ہی کیا انہیں کیونکر کٹے ہمارے دن

خدا بچائے قیامت کے ہیں تمہارے دن
یہ پیاری پیاری جوانی یہ پیارے پیارے دن

مجھے گذرتی ہے اک اک گھڑی قیامت کی
جو اس طرح سے گذارے تو کیا گذارے دن

کسی کے جاتے ہی گھر میں ہوئی وہ تاریکی
چراغ میں نے جلائے ہیں آج سارے دن

انہوں نے وعدہ کیا آج شب کو آنے کا
خوشی تو جب ہے خدا خیر سے گذارے دن

ہمیشہ تم کو مبارک ہو داغؔ روزِ نشاط
پھریں ہمارے بھی جیسے پھرے تمہارے دن

ملاتے ہو اُسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے
مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

بھرے ہیں تجھ میں وہ لاکھوں ہنر اے مجمعِ خوبی
ملاقاتی ترا گویا بھری محفل سے ملتا ہے

بظاہر باادب یوں حضرتِ ناصح سے ملتا ہوں
مرید خاص جیسے مرشدِ کامل سے ملتا ہے

جواب اس بات کا اس شوخ کو کیا دے سکے کوئی
جو دل لیکر کہے کمبخت تو کس دل سے ملتا ہے

غضب ہے داغؔ کے دل سے تمہارا دل نہیں ملتا
تمہارا چاند سا چہرہ مہِ کامل سے ملتا ہے

پھرے راہ سے وُہ یہاں آتے آتے
اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

مجھے یاد کرنے سے یہ مُدّعا تھا
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی، مہرباں آتے آتے

چلے آتے ہیں دل میں ارمان لاکھوں
مکاں بھر گیا میہماں آتے آتے

نتیجہ یہ نکلا، پھرے سب پیامی
وہاں جاتے جاتے یہاں آتے آتے

تری آنکھ پھرتے ہی کیسا پھرا ہے
مری راہ پر آسماں آتے آتے

بنا ہے ہمیشہ یہ دل باغ و صحرا
بہار آتے آتے، خزاں آتے آتے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آئے گی اردو زباں آتے آتے

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

کب کسی در کی جبہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

جو رہِ عشق میں قدم رکھّیں
وُہ نشیب و فراز کیا جانیں

پوچھئے میکشوں سی لُطف شراب
یہ مزا پاکباز کیا جانیں

حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں
لُطفِ عمرِ دراز کیا جانیں

جو گذرتے ہیں داغؔ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

٭

حالی

(۱۸۳۷ء ؛ ۱۹۱۴ء)

شمس العلما خواجہ الطاف حسین، پانی پت میں پیدا ہوئے۔ سترہ برس کی عمر میں دہلی آئے اور وہیں شعر و شاعری کا شوق ہوا۔ شیفتہ کی صحبت کا ان پر بڑا اثر پڑا۔ غالب کے شاگرد ہوئے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

حالی نے محکمۂ تعلیم میں کچھ دنوں لاہور اور پھر دہلی میں ملازمت کی

سرسید کی فرمائش پر "مسدسِ مدوجزرِ اسلام" لکھا جو تاریخی اور ادبی حیثیت سے ایک یادگار کارنامہ ہے۔ لاہور میں مولانا آزاد کی قائم کی ہوئی ادبی انجمن میں حالی نے بھی نمایاں حصہ لیا اور ان کی انگریزی طرز کی نظمیں اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

مسدس، نظموں اور مثنویوں کے علاوہ حالی غزل کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ ابتدائی غزلیں پرانے استعارات اور تشبیہات سے مزین ہیں اور اپنے طرز میں خوب ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کا رنگ سادگی کی طرف مائل ہوتا گیا۔ کچھ تو انگریزی اَدَب کا اثر تھا اور کچھ اس فطری نمو کا، جو ہر ایک حقیقی شاعر کو پختگی کے ساتھ اس رنگ کی طرف لاتا ہے۔ کُلیاتِ حالی کے ساتھ ان کا مقدمۂ شعر و شاعری، شائع ہوا۔ جس نے بڑی شہرت حاصل کی۔

اے عشق، تونے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا — جس گھر نے سر اُٹھایا، اس کو بٹھا کے چھوڑا
ابرار تجھ سے ترساں، احرار تجھ سے لرزاں — جو زد پہ تیری آیا، اس کو گرا کے چھوڑا
لاگ اور لگاؤ دونوں ہیں دلگداز تیرے — پتھر کے دل تھے جن کے اُن کو رُلا کے چھوڑا

افسانہ تیرا رنگیں رُوداد تیری دلکش　　شعر و سخن کو تو نے جادُو بنا کے چھوڑا

اک دسترس سے تیری حالیؔ بچا ہوا تھا
اس کے بھی دِل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

دِل سے خیالِ دوست بُھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے، کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط
اُلفت وُہ راز ہے کہ، چُھپایا نہ جائے گا
اے دِل، رِضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست
زنہار بارِ عشق اُٹھایا نہ جائے گا
مے تُند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں کہ پایا نہ جائے گا
جھگڑوں میں اہلِ دیں کے نہ حالیؔ پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ، چکایا نہ جائے گا

فلق اور دل ہیں رسوا ہو گیا
دلاسا تمہارا، بلا ہو گیا
دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا
نہیں بھولتا اسکی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
ٹپکتا ہے اشعارِ حالیؔ سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صورت

ہے غمِ روزِ جدائی، نہ نشاطِ شبِ وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

شوق میں اس کے مزا، درد میں اس کے لذّت
ناصحو، اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

جنّت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق
بدلیں گے تجھکو زندگیِ جاوداں سے ہم

لینے دو چین کوئی دم، اے مُنکر و نکیر
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

لذّت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جا کے حالیِ جادُو بیاں سے ہم

ہے جستجُو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط، مگر اس قدر کہاں

اک عُمر چاہیے کہ گوارہ ہو نیشِ عشق
رکھّی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں، وُہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا شبِ ہجراں میں نہیں!
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

محتسب صدق و صفا باں ہے انہیں کے دم تک
مصلحت برہمئ صحبتِ رنداں میں نہیں

بیقراری تھی سب اُمّیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وُہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

حالیٔ زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مردِ مسلماں میں نہیں

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو، دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہی نظر بازوں کی
دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی
زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز

چاہت اک طلعتِ مکروہ ہی برقع میں نہاں
کسی دلّالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

ہاتھ مَلنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے
تو جوانی میں نہ یہ روگ لگانا ہرگز

جتنے رَمنے تھے ترے ہو گئے ویراں ای عشق
آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گُل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب	دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی	کوئی دلچسپ مرقّع نہ دکھانا ہرگز
موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم	دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
لیکے داغ آئیگا سینے میں بہت اے سیّاح	دیکھ، اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک	دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز
مِٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو	اے فلک، اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
وُہ تو بھولے تھے ہمیں، ہم بھی نہیں بھول گئے	ایسا بدلا ہے، نہ بدلے گا زمانا ہرگز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں	نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رُلایا تو رُلایا اے چرخ	ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
یار خود روئیں گے، کیا ان پہ جہاں روتا ہے	ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز
آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی	بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز
بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں	نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر، گھر تھا تمہارا دِلّی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی، اب زندہ نہ ہوگی، یارو
یاد کر کر کے اُسے جی نہ کُڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانا ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لُطف شبانا ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں، بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

حق وفا کے جو ہم جتانے لگے
آپ کچھ کہہ کے مُسکرانے لگے

ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں — وہ اگر ہمت آزمانے لگے
ڈر ہے میری زباں نہ کھل جائے — اب وہ باتیں بہت بنانے لگے
جان بچتی نظر نہیں آتی — غیر اُلفت بہت جتانے لگے
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم — ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
جی میں ہے لوں رضائے پیرِ مغاں — قافلے پھر حرم کو جانے لگے
سرِّ باطن کو فاش کر یارب — اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالیؔ پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے — شکوے وہ سب سُنا کیے اور مہرباں رہے
یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام کشتی کسی کی پار ہو، یا درمیاں رہے

حالی کے بعد، کوئی نہ ہمدرد پھر مِلا
کچھ راز تھے، کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

حالی سے کام ہے یاں، فعلوں سے اسکے کیا کام
اچھا ہے یا بُرا ہے، پھر یار ہے ہمارا

یا رَب طلَبِ وصل ہو، یا ہو طربِ وصل
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں، وہ دِن نہ دکھانا

ہم کو بہار میں بھی سرِ گلستاں نہ تھا یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا
مِلتے ہی اُن کے، بھول گئیں کلفتیں تمام گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

ایک رنجش میں بُھلا دیتے ہیں سب　　ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں اگر

صُلح ہے ایک مہلتِ سامانِ جنگ　　کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ
علم کیا، اخلاق کیا، ہتھیار کیا　　سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں اُنہیں، مگر
وُہ آئے انجمن میں، تو پھر انجمن کہاں ؟

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت　　ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے　　ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا

کر دیا چُپ واقعاتِ دہر نے　　تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

وحید

(۱۸۲۹ء تا ۱۸۹۲ء)

وحید الدّین، قصبہ کڑا ضلع الہ آباد کے باشندے تھے۔ بشیر شاگرد آتش سے تلمذ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے زمانہ کے لکھنؤ کے طرز کو پسند نہیں کیا، بلکہ آتش کے سادہ اور صوفیانہ رنگ کی پیروی کی۔

کلام میں تصوّف کے مضامین اور جذباتِ حقیقی نہایت خوبی سے نظم کئے ہیں۔ شاگردوں میں اکبر الہ آبادی نے استاد کا نام روشن کیا۔

لالۂ خوش رنگ تھا جانِ چمن کیا ہو گیا　　　جلوۂ شمع شبستانِ چمن کیا ہو گیا

کیا ہوئی وہ نرگسِ شہلا کی چشمِ سُرمہ سا	دیدۂ شوخ غزالان چمن کیا ہو گیا
سُنبلِ سیراب کا کیا ہو گیا وہ پیچ و تاب	گیسوئے مرغولہ مویانِ چمن کیا ہو گیا
اے صبا نشو و نمائے غنچہ و گل کیا ہوئی	آب و رنگِ خُوب رویانِ چمن کیا ہو گیا
بلبلوں کے غنچۂ دل میں نہیں بُوئے نیاز	عشوۂ رنگیں ادایانِ چمن کیا ہو گیا
اپنے موقع پر نظر آتا نہیں کوئی نہال	انتظامِ نخلبندانِ چمن کیا ہو گیا
جامۂ شادی گلوں کون اُڑا کر لیگیا	وہ لباسِ نَوعروسانِ چمن کیا ہو گیا
جسکو دیکھو بے اجازت اب وہ رکھتا ہے قدم	بند و بست اہلِ کارانِ چمن کیا ہو گیا
کیا ہوئی وہ باغباں کی عقل جو سابق میں تھی	اب وہ افلاطونِ یونانِ چمن کیا ہو گیا
آب و تابِ چہرۂ گلہائے خنداں کیا ہوئی	جلوۂ روئے حسینانِ چمن کیا ہو گیا
کون سے ناواقفوں نے کاٹ ڈالا سرو کو	مصرعۂ موزونِ دیوانِ چمن کیا ہو گیا
کیا ہوئی باغِ جہاں سے خرمی کی وہ صدا	نغمۂ مرغِ خوش الحانِ چمن کیا ہو گیا
غنچہ و گل، یار و ساقی، شیشہ و جامِ شراب	اے وحید اپنا وہ سامانِ چمن کیا ہو گیا

اُٹھا لے جائیں گلشن سے کدھر ہم آشیاں اپنا
ہوا ہے عین فصلِ گل میں دشمن باغباں اپنا

کوئی شب اور وہ رشکِ قمر ہے میہماں اپنا
دکھلا لے چار دن کی چاندنی یہ بھی سماں اپنا

نہیں ہیں کونسی جا موت کی حسرت میں سرگرداں
فلک کرتا ہی وعدہ دیکھئے پورا کہاں اپنا

بُرے دن ہیں زمیں کب پانوٗں کے نیچے ٹھہرتی ہی
کیا کرتے ہیں شکوہ ہم نہیں ہے آسماں اپنا

چمن نازاں ہی کیا اپنی بہارِ چند روزہ پر
لئے جاتا ہی دل شوقِ بہارِ جاوداں اپنا

نہیں ہوش و خرد کی بر ہمی سودائے گیسو میں
اندھیری رات میں یہ لُٹ رہا ہی کارواں اپنا

بنایا دونوں عالم سے جُدا اک اور ہی عالم
جو پوچھا بیخودی سے ایک دن نام و نشاں اپنا
حلاوت سے مزے سے لطف و شیرینی سے مملو ہے
زباں اپنی، سخن اپنا، کلام اپنا، بیاں اپنا

کانٹے گُلوں کی جا نظر آتے ہیں باغ میں
کیا دیکھتے ہی دیکھتے نقشہ بدل گیا
رکھا تمہارے کوچۂ الفت میں جس نے پاؤں
وُہ منزلوں کی راہ تصوّر میں چل گیا
بس اپنے ایک رنگ پہ رہنے کی کس سے داد
ہم آج تک وہی ہیں، زمانہ بدل گیا

⁘

وُہ مے پلانے کا جس دم ارادہ کرتے ہیں
نگاہ مست سے مشتاق بادہ کرتے ہیں

جب اپنے منہ سے میں اقرارِ جرم کرتا ہوں
اب آپ کس لئے اس کا اعادہ کرتے ہیں

عجیب ظرف کے وُہ لوگ ہیں زمانے میں
جو حوصلے سے محبّت زیادہ کرتے ہیں

جدھر کو دیکھتے ہیں کچھ کمی محبّت کی
نگاہِ یاس اُدھر ہم زیادہ کرتے ہیں

زباں پہ کرتا ہے پہلے سے کوئی مہرِ سکوت
سوالِ وصل کا جب ہم ارادہ کرتے ہیں

جفا و ظلم ہو یا اب شکایتیں ہوں و چیار
غرض وُہ مجھ پہ عنایت زیادہ کرتے ہیں

ہزار بار خزاں آئے باغ میں تو کیا مری نظر میں ہیں کیفیتیں بہاروں کی

یہ ذکرِ دوست بھی سنتے نہیں لگا کر دل
وحیدؔ تنگ ہوں میں بے دلی سے یاروں کی

اک زمانہ کے جو پیچھے نہ روانہ ہوگا کیوں جی وہ بھی کوئی دنیا میں زمانہ ہوگا

غربت کی شام دیکھ کے رونا سا آگیا آنکھوں کے نیچے پھر گئی صبحِ وطن ابھی

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

سب کی ہے اس عہد میں مٹی خراب ذلّتیں باقی ہیں، توقیریں گئیں

کہیں ہوگا انساں ہزاروں میں ایک　　ہزاروں ہیں گو آدمی کی طرح

جائے گی لے کے اجل اپنے ہی مرکز کی طرف
شکر کی جا ہے کہیں اور نہ جانا ہوگا

مقامِ قرب آتا ہے نظر راہِ طریقت میں　　یہ کیسا راستہ ہے یہ تو کچھ منزل سے ملتا ہے

کس طرح کاٹیے ساون کی اندھیری راتیں
اب تو دلسوز نہیں شمع بھی جگنو کے سوا
یہ نہ پوچھو مجھے الفت نے دکھایا کیا کیا
کچھ جواب اس کا نہیں آنکھوں میں آنسو کے سوا

عجب بہار کا عالم نظر سے گذرا ہے
ہمیشہ تازہ رہے بوستاں خیالوں کا

کچھ عجب بات ہے، ہیں کفر پہ نازاں کافر
اہلِ اسلام سے سنتے ہیں کہ اسلام ہی خوب

کل خدا جانے کیا کریں گے وُہ
جن کو ہے فکر عمر بھر کی آج

کہا عمر بھر ہم نے دل کا فسانہ
کبھی آخری داستاں تک نہ پہونچے

داغ اور امیر کے ہمعصر

مجروح (۱۸۳۵ء-۱۹۰۲ء) میر مہدی، دہلی کے باشندے تھے۔ عرصہ تک الور اور رامپور میں قیام کیا۔ والد کا نام میر حسین فگار تھا۔ اور ان کے تخلّص کی رعایت سے مجروح کہلائے۔ کلام سادہ اور پُر اثر ہے۔ مرزا غالب کے شاگردِ رشید اور دوست تھے۔ استاد کے اکثر خطوط ان کے نام اردوئے معلّٰی میں موجود ہیں۔

کون پردہ میں ہے یہ زمزمہ ساز　　سخت دلکش ہے ساز کی آواز

آس توڑی شکستہ بالی نے　　خون ہو کیوں نہ حسرتِ پرواز
پل میں کر دے دلوں کو زیر و زبر　　قہر ہے وُہ نگاہِ سحر طراز
دل کہ تھا منبعِ فیوضِ ازل　　لُٹ گیا غم سے وُہ خزینۂ راز
آتی ہے ساز و بانگِ مطرب سے　　اُسی نیرنگ ساز کی آواز
اُس کا انجام کس نے دیکھا ہے　　جان جانا ہے عشق کا آغاز

دل کو برباد کر نہ اے بدخو
ہے یہ مجروح کا بڑا دمساز

یہ جو چُھپکے سے آئے بیٹھے ہیں　　لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں
یہ بھی کچھ جی میں آگئی ہو گی　　کیا وُہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں

شرم سے ہیں وُہ لاکھ پردے میں
گو مرے پاس آئے بیٹھے ہیں

زکی (۱۸۳۹ء؛ ۱۹۰۳ء) نواب سید محمد زکریا خاں رضوی۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ حدیث و فقہ، نجوم و موسیقی سے بھی شوق تھا۔ شعر و سخن میں غالب کے شاگرد تھے۔

ہم جو نازِ بتاں اٹھاتے ہیں　　ستم آسماں اٹھاتے ہیں
ایک سودائے وصل یار میں ہم　　کیسے کیسے زیاں اٹھاتے ہیں

نہ رہی باغ میں وہ آب و ہوا
ہم بھی اب آشیاں اٹھاتے ہیں

وصل ہو یا فراق ہو اس کا　　ستم روزگار ہیں دونوں
روز و شب ہے انہیں کسی کی تلاش　　مہر و مہ بیقرار ہیں دونوں
ہیں بلاتے ہیں وہ نہ آتے ہیں　　دل سے بے اختیار ہیں دونوں
آپ کا عہد، میری زیست ہے ایک　　سخت ناپائیدار ہیں دونوں

جب عشق مرا سُنا، تو ہنس کر
کہنے لگے، ہم کو بھی گماں تھا

پیری میں سختیاں ہیں یہ تعبیر ہے ذکی
دیکھا تھا خوابِ عیش جو عہدِ شباب میں

سالک (۱۸۲۹ء؛ ۱۸۹۳ء) مرزا قربان علی بیگ، حیدرآباد میں پیدا ہوئے دہلی میں پرورش پائی۔ پہلے مومن سے اور پھر غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ آخر عمر حیدرآباد میں گذاری، وہاں ایک رسالہ "مخزن الفوائد" نکلتا تھا، اُس کے مدیر رہے۔

سالک کا کلام سادہ اور پُر اثر ہے۔ ان کے بعض اشعار اتنے مشہور ہو گئے ہیں کہ ضرب المثل ہیں ؎

تنگدستی اگر نہ ہو سالک   تندرستی ہزار نعمت ہے

پہلے ستمگری کے لئے آسماں بنا　　کچھ بات رہ گئی تھی جو وہ دلستاں بنا
پہلے تمہارے آنے سے تھا یہ ہی تاب گل　　تم نے تو گلستاں کو دیا گلستاں بنا
وہ حال پوچھتے ہیں یہ دن پھر کہاں نصیب　　میری خموشیوں کو الٰہی بیاں بنا

پھر دولتِ وصال کی ساکت اُمید ہے
نادان کوئی بھی ہے بگڑ کر یہاں بنا

دشمن ہے اور کون جو برسائے یوں بلا　　کس طرح آسماں کو حدِ نظر کہوں

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پلتے ہیں　　بندے بندے ہیں لو خدائی کی

مدتیں گذریں وصالِ یار کو　　میری نظروں میں ابھی کی بات ہے

ہمّت سے دور کچھ نہیں بیت الحَرَم وَ لے
مدّت سے ہم تو کوچۂ جاناں کے ہو چکے

ازل سے ہم دلِ شاہ پسند کیا لائے
کہ جس طرف کو گئے اک بلا لگا لائے

بتوں کے عشق نے یکساں کیا زمانے کو
نہ کوئی خاص جہاں میں نہ کوئی عام رہا

اگر ہوئی بھی قیامت تو کون دیکھے گا
اسی طرح جو نظر میں ترا خرام رہا

ظہیرؔ (۱۸۳۹ء۔ ۱۹۱۱ء)۔ راقم الدّولہ سیّد ظہور الدین، دہلی کے باشندے تھے۔ ان کے والد فنِ خوشنویسی میں بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد تھے غدر کے بعد ظہیرؔ بہ سلسلۂ ملازمت ریاست الور، جے پور اور ٹونک میں ایک

عرصہ تک رہے۔ آخر عمر میں حیدرآباد گئے اور وہیں انتقال کیا۔ ذوق کے شاگرد تھے۔ خود کہتے تھے کہ مومن کا رنگ اختیار کیا۔

ہر ایک زخم پر ہے قصد لوٹ جانے کا
کہ فکر ہے مجھے قاتل کے دل بڑھانے کا

بہ رنگِ غنچۂ تصویر باغِ ہستی میں
ہوا نہ حکم کبھی ہم کو لب ہلانے کا

وہ بے نصیب ازل ہوں کہ بجلیاں ٹوٹیں
جو منہ سے نام لیا آشیاں بنانے کا

کسی کے ناز و نزاکت پہ مر مٹے ہم تو
دل و دماغ کہاں اب ستم اٹھانے کا

بھلا ظہیر کو کیا بزمِ وعظ سے نسبت
وہ ایک رند ہے بگڑا ہوا زمانے کا

بُرے دن جب کہ آتے ہیں، تو شامت بن کے آتے ہیں
محبت بن کے آتے ہیں، طبیعت بن کے آتے ہیں

کچھ ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ اک اک منہ کو تکتا ہے
ہم اُن کی بزم سے تصویرِ حیرت بن کے آتے ہیں

یہی شرم و حیا ہے، جو بدل جاتی ہے شوخی سے
یہی انداز ہیں جو ناز و نخوت بن کے آتے ہیں
یہ دو حرفِ تمنّا ہیں، سمجھ لو جس طرح چاہو
حکایت بن کے آتے ہیں شکایت بن کے آتے ہیں
وہ آتے ہیں تو آئیں، اے ظہیر اتنا مگر کہہ دیں
مقدّر بن کے آتے ہیں کہ قسمت بن کے آتے ہیں

مُنیر شکوہ آبادی: (۱۸۱۹ء تا ۱۸۸۱ء) سیّد اسمٰعیل حسین، مین پوری کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ پہلے ناسخ اور پھر رشک سے اصلاح لیتے تھے۔ آخر عمر دربار رامپور کے زیر سایہ بسر کی۔ منیر نے بڑی مشکل سنگلاخ زمینوں میں طولانی غزلیں لکھی ہیں۔ اکثر مناسباتِ لفظی پر زور دیا ہے۔ یہ غزل مشہور ہے

سُرخیِ شفق کی زرد ہو گالوں کے سامنے   پانی بھرے گھٹا ترے بالوں کے سامنے

شرمندہ نجم ہوں ترے خالوں کے سامنے
گوروں کی فوج ہٹ گئی کالوں کے سامنے

ثابت رہا فلک مرے نالوں کے سامنے
ٹھہری سپر حباب کی بالوں کے سامنے

موسیٰ سے کہدو طور پہ جایا کریں نہ روز
اچھے نہیں ہیں برق جمالوں کے سامنے

آنکھیں کھلی ہیں کاکل پیچاں کی یاد میں
دیکھو، چراغ جلتے ہیں کالوں کے سامنے

جنسِ سخن کا کوئی نہیں قدرداں منیر
شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

جلال (۱۸۳۵ء ؛ ۱۹۰۹ء) : حکیم سید ضامن علی، رشک کے شاگرد تھے۔ ان کو زبان کی تحقیق سے کافی دلچسپی تھی۔ اور لغات، قواعد اردو اور فنِ عروض و قافیہ پر کئی مستند کتابیں لکھی ہیں۔ کلام میں ناسخ اور رشک کا رنگ جھلکتا ہے۔ شاگردوں میں آرزو لکھنوی مشہور ہوئے۔

نمونۂ کلام:

وُہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ مِلا
ملا وُہ غم کدہ جس میں چراغ بھی نہ ملا

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بُو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ مِلا

اسیر کر کے ہمیں کیوں رہا کیا صیّاد
وُہ ہمصفیر بھی چھوٹے، وُہ باغ بھی نہ ملا

جلالؔ، باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے، ہم کو داغ بھی نہ ملا

تسلیم (۱۸۲۰ء، ۱۹۱۱ء): منشی امیر اللہ، ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ لیکن عمر کا زیادہ حصّہ لکھنؤ میں گذرا۔ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے ؎

میں ہوں اے تسلیمؔ شاگردِ نسیمؔ دہلوی
مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

باوجود اس کے تسلیم کا رنگ اُس زمانہ کے لکھنؤ کے شعرا سے مختلف نہیں۔
البتہ ان کے شاگرد حسرت موہانی نے مومن اور نسیم دہلوی کے رنگ کو چمکایا۔

جلوہ گر زیرِ زمیں شمس و قمر کچھ بھی نہیں
یہ وہ عالم ہے جہاں شام و سحر کچھ بھی نہیں

بادہ و جام و صراحی ترے دم تک سب تھے
تو جو محفل میں نہیں، رشکِ قمر کچھ بھی نہیں

کس قدر زود فراموش ہے یادِ محبوب
رات بھر سیکڑوں وعدے تھے سحر کچھ بھی نہیں

نکہتِ گل ہوں کہ ہوں تشنۂ صہبا، پر کیا
یوں تو کہنے کو میں سب کچھ ہوں مگر کچھ بھی نہیں

جیتے جی سب تھے مری جان کے دشمن تسلیم
مرتے ہی کاہشِ دل سوزِ جگر کچھ بھی نہیں

نالہ کھنچا ہے، دل ہے خفا، شوق ہے اُداس
تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

کچھ کہدو جھوٹ سچ کہ توقع بندھی رہے
توڑو نہ آسرا دلِ اُمّید وار کا

ڈھونڈتا ہے رات دن لیکر چراغ مہر و ماہ
کیا ترا اے آسمانِ پر جفا جاتا رہا

کیونکر کہوں وُہ فتنۂ محشر نہیں ملتا
ملتا ہے مگر دل سے ستمگر نہیں ملتا
کیا چین سے نیند آئیگی منعم کو تہِ خاک
سنتا ہوں یہاں بالش و بستر نہیں ملتا

تشنہ : محمد علی تشنہ، ذوق کے شاگرد تھے۔ اکثر ایک مجذوبانہ کیفیت میں رہتے تھے۔ اِن کی یہ غزل مشہور ہے۔

کیا کہا، پھر تو کہو، دل کی خبر کچھ بھی نہیں
پھر یہ کیا ہے، خمِ گیسو میں اگر کچھ بھی نہیں

جذبۂ دل نے کیا ہائے اثر کچھ بھی نہیں
ہم یہاں مرتے ہیں اور اُن کو خبر کچھ بھی نہیں

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے
تم کو سب کی ہے خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع بھی، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے، پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے، سب کہتے ہیں یوں ہی یوں ہی
فتنہ ہے اِک تری ٹھوکر کا، مگر کچھ بھی نہیں

شمع مغرور نہ ہو، بزم فروزی پہ بہت
رات بھر کی یہ تجلّی ہے، سحر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر کچھ نہ کرے جب تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

رشید: سیّد مصطفیٰ میرزا۔ عرف پیارے صاحب۔ مرثیہ اور غزل، دونوں کے قادرالکلام شاعر تھے۔ عشق اور تعشق کے بھتیجے اور میر انیس کے نواسے تھے۔ زبان کی شیرینی اور لطافت کے ساتھ ایک مخصوص شگفتگی ان کے کلام کا خاص جوہر ہے ۔

نمونہ کلام:

قیدِ ہستی سے چھٹے سارے اسیرانِ قفس
ہم بھی دو چار گھڑی اور ہیں مہمانِ قفس
ہمصفیرانِ چمن نے نہ کیا استقبال
در تک آکر مجھے پہونچا گئے یارانِ قفس
دونوں عالم جنہیں کہتے ہیں حقیقت میں وُہ ہیں
صبح مرغانِ چمن شام اسیرانِ قفس

تشنہ لب کون ہے میخانے میں — مے ٹھہرتی نہیں پیمانے میں
ایک جلوہ سا نظر آتا ہے — کوئی تو ہے مرے غم خانے میں
یوں ہے سینہ میں دلِ پُرحسرت — قبر جیسے کوئی ویرانے میں
حرفِ شکوہ نہیں لایا لب تک
بات اتنی رہی دیوانے میں

آج کل کے دوست کیا ہیں جس طرح کاغذ کے پھول
دیکھنے میں خوشنما، بوئے وفا کچھ بھی نہیں

بُجھ رہے ہیں داغِ دل تربت میں جانے کیلئے
روشنی کم ہو رہی ہے نیند آنے کے لئے

چشمِ گریاں حُسن سے معمور ہے چاندنی برسات کی مشہور ہے

حسن بریلوی: داغ کے مشہور شاگردوں میں تھے۔ ان کے کلام میں سادہ عاشقانہ مضامین کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں استاد کی شوخیوں کی جھلک نظر آتی ہے:

نمونہ کلام:ے

تجھ سے مل کر کس قدر خوش ہے دلِ دیوانہ آج
ساری دنیا میں سمائے گا نہ یہ ویرانہ آج
کیا کہوں، کیا کہہ رہی ہے یہ گھٹا، یہ فصلِ گُل
کیا کہوں، کیا چاہتے ہیں شیشہ و پیمانہ آج
آپ پر جادو بھری آنکھوں کا افسوں چل گیا
اے حسنؔ سب کی زباں پر ہے یہی افسانہ آج

⁂

وُہ مجھ سے بے خبر ہیں، اُن کی عادت ہی کچھ ایسی ہے
میں اُن کو یاد کرتا ہوں، محبّت ہی کچھ ایسی ہے
میں آؤں وعظ میں سو بار، جب یہ دل بھی آنے دے
کروں کیا واعظو! رندوں کی صحبت ہی کچھ ایسی ہے
میں کس گنتی میں ہوں، اور اک مرے دل کی حقیقت کیا
ہزاروں جان دیتے ہیں، وُہ صورت ہی کچھ ایسی ہے

ہمارا کیا بگڑ جاتا حسنؔ تیری سفارش میں
ہماری اُن کی اب صاحب سلامت ہی کچھ ایسی ہے

اے حسنؔ ہم تو سفارش تری کر دیں سو بار
ذِکر بھی تو کبھی اس بزم میں تیرا آئے

ہائے اس بدنصیب کی قسمت — یہ نگاہِ کرم جدھر نہ ہوئی

ایسے مجرم کا کیا ٹھکانا ہے — جس کی سرکار مدعی ہو جائے

حفیظؔ : حفیظ جونپوری۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ۔سہ

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے — ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی
اور مرتے ہیں تو پیماں شکنی ہوتی ہے

لٹ گیا وہ ترے کوچے میں رکھا جس نے قدم
اس طرح کی بھی کہیں راہزنی ہوتی ہے

میکشوں کو نہ کبھی فکر کم و بیش ہوئی
ایسے لوگوں کی طبیعت بھی غنی ہوتی ہے

پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظ
صاف انکار میں خاطر شکنی ہوتی ہے

گستاخ، کرامت اللہ خاں شاگرد امیر مینائی۔

ساغر میں شکل دخترِ رز کچھ بدل گئی
خم سے نکل کے نور کے سانچے میں ڈھل گئی

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

دامن میں دخترِ رز نے لگایا ضرور داغ
جس پارسا کی گود میں جا کر مچل گئی

گھبرا کے بولے نامۂ گستاخ تو نہیں
جب اُن کے پاس کوئی ہماری غزل گئی

باب نہم۔ بیسویں صدی کے شعراء

پہلی جنگ عظیم کے بعد آزادی کی رَو دُنیا میں تیزی سے پھیلی اور ہندوستان میں انگریزی حکومت سے بیزاری پیدا ہوگئی۔ اس کا اثر ادب اور شاعری پر پڑنا ضروری تھا۔ اکبرالہ آبادی نے اپنے کلام سے قومی جذبات کو اُبھارا اور پہلی مرتبہ مغربی تہذیب کی بُرائیوں کی طرف اپنے مخصوص انداز سے طنزیہ پیرایہ میں توجّہ دلائی۔ چکبستؔ نے ہندوستان کی پُرانی تاریخ کی بعض داستانوں کو بڑی خوبی سے نظم کیا۔ اقبالؔ نے اسلامی تہذیب و تمدّن کی عظمت کی یاد تازہ کی حسرت

موہانی نے غزلیں پُرانے انداز میں لکھیں۔ لیکن خود آزادی کی جنگ میں صفِ اوّل میں نظر آئے ؎

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقّت بھی
اک طُرفہ تماشہ ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

مرزا رسواؔ کے کلام پر قدیم و جدید فلسفہ کا بڑا اثر پڑا ہے۔ جگرؔ مرادآبادی اور حفیظؔ جالندھری کا رنگ زمانہ کے ساتھ بدلتا ہوا ہم دیکھتے رہے ہیں۔ جوشؔ ملیح آبادی اور فیض احمد فیضؔ شاعرانِ انقلاب کہلائے۔ بلاشبہ اردو شاعری زمانہ کی رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ یہاں تک کہ مشاعروں میں اکثر غیر معروف شعرا کا کلام جو سُننے میں آتا ہے اُس میں بھی آپ اکثر نئے خیالات اور نئے رجحانات صاف دیکھ سکتے ہیں۔

پُرانے رنگ کی اردو شاعری سترھویں اور اٹھارہویں صدی کی انگریزی شاعری سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ یہاں تک کہ بعض تشبیہات اور استعارات

بھی ملتے جُلتے ہیں۔ اگر ڈرائڈن اور پوپ کا ترجمہ اردو میں کیا جائے تو سودا اور ذوق سے مشابہ نظر آئے گا۔

اس ملک میں جدید ادب اور شاعری کا علم بردار مرزا غالبؔ کو کہنا چاہئے۔ اس لئے کہ سب سے پیشتر آپ اُن کے کلام میں وُہ طنز اور فلسفیانہ نازک خیالی دیکھیں گے جو دورِ جدید کے ادب کی سب سے نمایاں خصوصیات ہیں۔ اُن کے بعد حالیؔ اور آزادؔ۔ مرزا رسواؔ۔ اصغرؔ۔ اور سب سے زیادہ علّامہ اقبالؔ نے اس طرز کو فروغ دیا لیکن بیسویں صدی کے تمام شعرا میں کم و بیش یہ خصوصیات نظر آتی ہیں۔

دورِ حاضر ہمارے ملک میں ہی نہیں بلکہ ساری دُنیا میں شاعری کے لئے ناساز گار پایا گیا ہے۔ اس زمانہ میں فردوسیؔ، حافظؔ، خیّامؔ، ملٹنؔ، شیکسپیئرؔ، میر تقی میرؔ اور غالبؔ کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ اس لئے کہ جدید رجحانات انسان کو رومانی فضا سے بہت دور لے جارہے ہیں۔

اکبر

(۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء)

سید اکبر حسین رضوی، الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ وحید سے تلمذ رکھتے تھے۔ باوجود سرکاری ملازمت کی بندشوں کے قوم کی اصلاح اور ترقی کے لئے اپنا کلام وقف کر دیا تھا۔ انگریزی تہذیب کی برائیوں اور اس کی بے جا نقالی کے خراب اثرات کی طرف انہوں نے سب سے پہلے توجہ دلائی۔

اکبر نے غزل کی شاعری کا دامن بہت وسیع کر دیا ہے۔ عاشقانہ مضامین کے علاوہ فلسفیانہ اور اخلاقی نکتے، پولٹیکل اور سوشل مضامین نہایت آسانی سے

بیان کر دئے ہیں جس سے ان کی قدرتِ کلام کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ابتدائی غزلوں میں ذوق کا رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ ایک مخصوص طنز، شوخی اور ظرافت کی چاشنی ہے۔ جس نے ان کے کلام کو اس قدر ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا　　آنکھ اُن سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا
جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا　　بلبل گُلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا
اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو　　سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا
تشبیہہ ترے چہرے کو کیا دوں گُلِ تر سے　　ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں، تو ہو جاتے ہیں بدنام
وُہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

جلوہ نظر آیا نہیں اے یار تمہارا　　تڑپا ہی کیا طالبِ دیدار تمہارا
بڑھنے تو ذرا دو اثرِ جذبہ دل کو　　قائم نہیں رہنے کا یہ انکار تمہارا

ہر دم نظرِ شوق کیا کرتا ہوں تم پر
ہر وقت میں رہتا ہوں گنہگار تمہارا

عازم ہو تم اے حضرتِ وصل کوئے بتاں کے
اللہ رہے یار و مددگار تمہارا

کس ناز سے کہتا ہے شبِ وصل وہ ظالم
برہم نہ کرے گیسوؤں کو پیار تمہارا

اکبر کی تمناؤں سے کہتا ہے یہ گردوں
اس دور سے اٹھنے کا نہیں بار تمہارا

یہ کس سے سیکھا ہے تیری آنکھوں نے اس بلا کی نگاہ کرنا
بنائے دیں کو خراب کرنا دلوں کو اتنا تباہ کرنا

کہیں گے تعمیل ذات پر ہو، نشان دو یا پتہ بتاؤ
بتوں کے آگے ہے سخت مشکل خدا کو اپنا گواہ کرنا

نئی ادا یہ نہیں فلک کی، سدا سے اس کا یہی ہے شیوہ
کسی کو حد سے سوا بڑھانا، کسی کو بالکل تباہ کرنا

جہانِ صورت کا ذرّہ ذرّہ جمالِ معنی کا آئینہ ہے
مگر انہیں کو جو دیکھتے ہیں، جو جانتے ہیں نگاہ کرنا

کہے کوئی شیخ سے یہ جا کر کہ دیکھئے آ کے بزمِ سیّد
یہ رونق اور یہ چہل پہل ہو، تو کیا بُرا ہے گناہ کرنا

وُہ دورِ چرخ آ رہا ہے اکبرؔ کہ اہلِ تقویٰ ہیں زارو مُضطر
بزرگ بھی طفلِ دل کو اپنے سکھا رہا ہے گناہ کرنا

روز افزوں ہو محبّت، وُہ ملاقات اچھّی
شوق ملنے کا بڑھاتی رہے، وہ بات اچھی

شب برات اچھّی ہے اے جان نہ اچھی شبِ قدر
آپ حصّہ میں مرے آئیں، وہی رات اچھّی

ہم بغل شاہدِ دلجو ہو، تو جاڑا اچھا
ہم نشیں ساقیِ مہوش ہو تو برسات اچھّی

ہو نمود اپنی تو اندھیر کی پروا کس کو
کوئی تاروں سے جو پوچھے تو کہیں رات اچھّی

بہت رہا ہے کبھی لطف یار ہم پر بھی
گذر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی

عروسِ دہر کو آیا تھا پیار ہم پر بھی
یہ بیسوا تھی کسی شب نثار ہم پر بھی

بٹھا چکا ہے زمانہ ہمیں بھی مسند پر
ہوا کئے ہیں جواہر نثار ہم پر بھی

ہم ایسے رند، مگر یہ زمانہ ہے وہ غضب
کہ ڈال ہی دیا دنیا کا بار ہم پر بھی

میرے حواس عشق میں کیا کم ہیں منتشر
مجنوں کا نام ہو گیا، قسمت کی بات ہے

مطلق نہیں محلِ عجب موت، دہر میں
مجھکو تو یہ حیات ہی حیرت کی بات ہے

راضی تو ہو گئے ہیں وہ تاثیر عشق سے
موقع نکالنا، سو یہ حکمت کی بات ہے

بہت دن محتسب کے ہاتھ سے جام و سبو ٹوٹے
شکایت کیا اگر دستِ سبو سے اب وضو ٹوٹے

کچھ ایسا بڑھ گیا ہے حسنِ لطفِ ساقیِ دوراں
ہزاروں شیشۂ تقویٰ پڑے ہیں چار سُو ٹوٹے

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے
خاتمہ عیش کا حسرت ہی پہ ہوتے دیکھا
رو ہی کے اُٹھتے ہیں اس بزم سے گانے والے
حدِ ادراک میں داخل نہ ہوا سرِّ ازل
کچھ سمجھ ہی نہ سکے ہوش میں آنے والے
آپ اندھیرے میں بجلی سے مدد لیتے ہیں
چاند سورج ہیں ہمیں راہ دکھانے والے
بارِ احساں جسے کہتے ہیں وہ ہے کوہِ جفا
کاش نادم ہوں یہ احسان جتانے والے

قدمِ شوق بڑھے اُن کی طرف کیا اکبر
دل سے ملتے نہیں یہ ہاتھ بڑھانیوالے

خبر ملتی نہیں کچھ مجھکو یارانِ گذشتہ کی
خدا جانے کہاں ہیں، کس طرح ہیں، کیا گذرتی ہے

بچاتا ہے ہزاروں کفر سے، اے واعظِ ناداں
بلائے دامِ گیسوئے بتاں میں مبتلا ہونا

بے عشق کے جوانی کٹنی نہیں مناسب — کیونکر کہوں کہ اچھا ہے جیٹھ کا نہ تپنا

عالمِ فطرت پہ ہے میری نظر بھی اے حکیم — فرق یہ ہے تجھکو عقل آئی، مجھے حال آگیا

جو دانشمند ہیں وُہ یہ دعا دیتے ہیں لڑکوں کو
نہ ہو مکّار پیری میں، نہ عاشق ہو جواں ہو کر

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سُلجھا رہا ہے، اور سِرا ملتا نہیں

ناز کیا اس پہ زمانہ نے جو بدلا ہے تُمہیں
مرد وُہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں

ادائے شُکر کرکے احتراز اولیٰ ہے اے اکبرؔ
ہزاروں آفتیں پنہاں ہیں اُن کی مہربانی میں

تعجّب نَخوتِ اہلِ زمیں پر مُجھکو آتا ہے
یہ اُس پر کیوں اکڑتے ہیں کہ جس میں مر کے گڑتے ہیں

اچھی نہیں شے کوئی محبت سے زیادہ
وہ بھی ہے، بُری جو ہو ضرورت سے زیادہ

جس کو سارا قصۂ عہدِ جوانی یاد ہو
کیا عجب ہے عہدِ پیری میں جو وہ ناشاد ہو

سُنتے ہیں کہ اکبر نے کیا عشقِ بُتاں ترک
اس بات سے تو خُوش نہ ہوا ہوگا خدا بھی

ضروری کام جو نیچر کا ہے کرنا ہی پڑتا ہے
نہیں جی چاہتا مُطلق مگر مرنا ہی پڑتا ہے

اُن کی نگہِ مست ہے لبریزِ معانی
ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

اُمیدیں ٹُوٹتی ہیں تو بہت صدمہ پہنچتا ہے
جو امّیدیں کرے گا کم اُسے صدمے بھی کم ہونگے

جو میں روتا ہوں کہ افسوس زمانہ بدلا
مجھ پہ ہنستا ہے زمانہ، کہ تُمھیں وُہ نہ رہے

چکبست

(۱۸۸۲ء ؎ ۱۹۲۶ء)

پنڈت برج نرائن، فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ وہیں وکالت کی اور شعر و شاعری میں بھی ناموری حاصل کی۔

چکبست نے شاعری کے متعلّق اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا "میں پُرانے رنگ کی شاعری اور غزل گوئی سے ناآشنا ہوں لیکن اس کے ساتھ میرا عقیدہ ہے کہ محض نئے خیالات کو توڑ مروڑ کر نظم کر دینا شاعری نہیں ہے۔ میرے خیال کے مُطابق خیالات کی تازگی کے ساتھ زبان میں شاعرانہ لطافت اور الفاظ میں

تاثیر کا جوہر ہونا ضروری ہے۔" اس بیان میں شاید "پرانے رنگ کی شاعری" سے چکبست کی مُراد بناوٹ اور معاملہ بندی کی شاعری ہے، جو اُس زمانہ میں رائج تھی۔ ان کی اپنی غزلوں میں عاشقانہ مضامین نسبتاً کم نظر آتے ہیں۔

بہارِ گُل میں دیوانوں کا صحرا میں پرا ہوتا ۔۔۔ جدھر اٹھتی نظر، کوسوں تلک جنگل ہرا ہوتا
اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا ۔۔۔ نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا
ہزاروں جان دیتے ہیں بُتوں کی بیوفائی پر ۔۔۔ اگر ان میں سے کوئی باوفا ہوتا تو کیا ہوتا
یہ مانا بے حجابانہ نگاہیں قہر کرتی ہیں ۔۔۔ مگر حُسنِ حیا پرور کا عالم دوسرا ہوتا
خدا کو بھول کر انسان کے دل کا یہ عالم ہے ۔۔۔ یہ آئینہ اگر صورت نما ہوتا تو کیا ہوتا
اگر دم بھر میں مٹ جاتی خلش خارِ تمنا کی ۔۔۔ دلِ حسرت طلب کو اپنی ہستی سے گلا ہوتا

زباں کے زور پر ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

ہم کو منظور ہے اے دیدۂ وحدت آگیں
ایک غُنچہ میں تماشائے گلستاں ہونا

سر میں سودا نہ رہا، پاؤں میں بیڑی نہ رہی
میری تقدیر میں تھا بے سر و ساماں ہونا

صفحۂ دہر پہ جوہرِ قدرت دیکھو
پُھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

ہو بیاضِ سحرِ نُور پہ دل کیا مائل
یاد ہے دفترِ انجُم کا پریشاں ہونا

کل بھی وُہ کل جو ہے فردائے قیامت زاہد
اور پھر اُس کے لئے آج پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خُمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

مقامِ کوچ کیا ہے منزلِ مقصود تک سب لے
قیامت تھا سرائے دہر میں دُو دن ٹھہر جانا

بہت سودا رہا واعظ تجھے نارِ جہنم کا
مزا سوزِ محبت کا بھی کچھ اے بے خبر جانا

مُصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کُھلتے ہیں
مُبارک بُزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید رُوح نے گردِ سفر جانا

دوستی میں اپنا اپنا حق ادا کرتے رہے
وُہ جفا کرتے رہے اور ہم وفا کرتے رہے
کیا کہیں کس سے کہ ہم دنیا میں کیا کرتے رہے
بدعتیں ہوتی رہیں، شُکرِ خدا کرتے رہے
اہلِ ہمّت منزلِ مقصود تک آبھی گئے
بندۂ تقدیر قسمت کا گِلا کرتے رہے

شجر سکتے میں ہیں خاموش ہے بُلبل نشیمن میں
سدھارا قافلہ پُھولوں کا سنّاٹا ہے گلشن میں
ہوائے تازہ دل کو خود بخُود بے چین کرتی ہے
قفس میں کہہ گیا کوئی بہار آئی ہے گلشن میں

شبابِ آیا ہے پیدا رنگ ہے رُخسارِ نازک سے
فروغِ حُسن کہتا ہے سحر ہوتی ہے گُلشن میں

متاعِ دردِ دِل اک دولتِ بیدار ہے مجھکو
دُرِ شہوار ہیں اشکِ محبت میرے دامن میں

بہار آئی ترقّی پر ہے سودا دم بہ دم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا
لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر
یہ وُہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا
کشاکش ہے اُمید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے
الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھّا تھا عدم میرا
کھڑی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنّائیں
شہیدِ یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی
اسی پر ختم ہے افسانۂ دردِ الم میرا

ہر دم ہے طبیعت کو اُلجھن، اک یاس کا عالم طاری ہے
یہ سانس نہیں اک کانٹا ہے یہ زیست نہیں بیماری ہے

شاد

(۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۷ء)

سیّد علی محمد، عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ فنِ شاعری میں خود اپنی توجہ اور محنت سے مہارت حاصل کی کسی کے شاگرد نہ تھے۔ کلام میں خوبصورت بندشیں اور صنّاعی پائی جاتی ہے۔

آئی خزاں بہار کا موسم نکل گیا — کیوں اے نسیم تیرا کلیجہ نہ جل گیا

اس باغ میں بہار و خزاں کچھ نہیں نہیں — دل کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

قاصد، مریضِ عشق سدھارا جہان سے — اب کے پیام وصل کا جادو نہ چل گیا

غفلت میں ہوئے اوقات بسر اے عُمرِ گُریزاں کچھ نہ کیا
کی فکرِ وصالِ یار بہت لیکن سر و ساماں کچھ نہ کیا

جُنبش سے تری مقتل ہوتا اک آن میں دشتِ کرب و بلا
عُشّاق کی بے باکی کے عوض اے ابروئے تیّراں کچھ نہ کیا

اُلٹا نہ عراق و شام و حلب، دنیا نہ ہوئی ویران تو کیا
جل تھل نہ لہو سے تو نے بھرا تو خونِ مُسلماں کچھ نہ کیا

اے ننگِ جہاں، اے شاد، بتا کچھ آئی بھی تجھ کو شرم و حیا
اے جہلِ مرکّب، اے حیواں، اے بے خبر انساں، کچھ نہ کیا

وُہ کیسی نعمت تھی اے محبّت کہ جس نے ہر شخص کو مٹایا
نہ نیست ہونے کا جی میں کھٹکا نہ ہست کا لُطف کوئی پایا

نظر میں ویراں ہے بزمِ عالم، بغیر دل کے یہ ہم نے پایا
جو دل پہ الزام ہے گیا کیوں ہمیں نے خُود دے کے کیا بنایا

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینا اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں، جینا اسی کا ہے

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے

مکدّر یا مُصفّا جس کو یہ دونوں ہی یکساں ہیں
حقیقت میں وہی میخوار ہے، پینا اُسی کا ہے

اُمیدیں جب بڑھیں حد سے طلسمی سانپ ہیں زاہد
جو توڑے یہ طلسم اے دوست، گنجینا اسی کا ہے

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شاد پیری میں
کہ جس کو منھ دکھانا ہے یہ آئینا اسی کا ہے

اُمید اور وہ بھی کس کی، اے دل، وصال سی شئے کی اُف نہ کچھ کہہ
ہمیشہ دھوکے پہ کھائے دھوکے، ہمیشہ رہ رہ کے آزمایا

کہاں یہ ریشِ سفید اپنی، کہاں جوانوں کی بزم ساقی
بُرا ہو اس شوق کا الٰہی، ہمیں بھی کافر لگا کے لایا
انہیں جو منظور دیکھنا ہو تو آ کے سینے میں دیکھ جائیں
لیا سنبھالا مریضِ غم نے، چراغ رہ رہ کے جھلملایا
بتاؤ لِلّٰہ مُنصفی سے، یہ تذکرہ کر رہا ہوں دل کا
یہی وفا تھی یہی مروّت، کہ پھر کے شامت زدہ نہ آیا

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
نہیں اُٹھتے قدم اب جانب دیر
کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں
ستایا آ کے پہروں آرزو نے
جو دم بھر آپ میں پایا گیا ہوں
نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں
دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں آپ آیا نہیں لایا گیا ہوں

کُجا میں اور کُجا اے شادؔ دُنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوّب اے ساقی
خُم آئیگا، صُراحی آئے گی، تب جام آئے گا

مری مایُوسیوں کو کچھ نہ پُوچھو   نہ دُنیا کا بھروسہ ہے نہ دیں کا

اپنی ہستی کو غم و درد و مُصیبت سمجھو
موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو

ریاؔض

(۱۸۵۳ء تا ۱۹۳۵ء)

خیرآباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ پہلے اسیرؔ اور پھر امیرؔ مینائی کے شاگرد ہوئے، خیرآباد، گورکھپور اور لکھنؤ میں عمر کا زیادہ حصہ گذارا۔ اکثر غزلوں میں ان جگہوں کا ذکر ہے ؎

ریاؔض تھی جو مقدر میں بازگشتِ شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

جوانی جن میں کھوئی ہے وہ گلیاں یاد آتی ہیں

بڑی حسرت سے لب پر ذکرِ گورکھپور رہتا ہے

ریاض کو اخبار نویسی سے بہت دلچسپی تھی، اور اپنی زندگی میں کئی اخبار اور رسالے شائع کئے۔

ریاض کے کلام میں داغ کی شوخی، جرأت کا عاشقانہ انداز، امیر مینائی کی رنگینی اور اپنا ایک مخصوص رندانہ بانکپن اور طرزِ ادا پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں اکثر ایک ظرافت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ جس میں شوخی اور طنز کی آمیزش ہے۔

ریاض اُن لوگوں میں سے تھے جن کے دل جذبات سے لبریز ہوتے ہیں لیکن ہونٹوں پر ایک طنزیہ تبسّم دکھائی دیتا ہے جس شخص سے انتہائی محبّت کریں گے۔ اس کا بھی مضحکہ اُڑائیں گے۔ شراب نہیں پیتے لیکن ہر وقت خُم پر خُم لنڈھا رہے ہیں۔ یہ دروغ گوئی کی شاعری نہیں۔ اس لئے کہ شاعر کی طبیعت کی اصلی کیفیت پوشیدہ نہیں۔ البتّہ مزاج کی خودداری اور طبیعت کی اُبلتی ہوئی شوخی کے باعث

ان کی تیز ذہانت طنز کی طرف جانے پر مجبور ہوتی ہے

یہ ذوق ادب مست مے ہوش رُبا کا
لغزش ہے قلم کو جو لکھا نام خدا کا

جنّت کی ذرا اہلِ جہنّم کو بھی ہو قدر
جھونکا ادھر آجائے کوئی سرد ہوا کا

جانا تھا کہ آنا تھا جوانی کا الٰہی
سیلاب کی ننھی موج کہ، جھونکا تھا ہوا کا

کچھ شوخیٔ رفتار میں بھی کم ہے قیامت
کچھ قد بھی نکلتا ہے بُت شوخ ادا کا

نشّے میں جھکی پڑتی ہیں یوں ہی تری آنکھیں
چھیڑوں سے مری اور بڑھا بوجھ حیا کا

دل چھینتی ہیں اور جھکی جاتی ہیں آنکھیں
شوخی میں بھی جاتا نہیں انداز حیا کا

معشوق ریاضؔ اٹھ گئے اس بزم سے کیا کیا
جاتی ہوئی دُنیا ہے، رہے نام خُدا کا

مکان دیکھے، مکیں دیکھے لامکاں دیکھا
کہاں کہاں تجھے ڈھونڈا کہاں کہاں دیکھا

ذرا جو ہم نے اُنہیں آج مہرباں دیکھا
نہ ہم سے پوچھئے کیا رنگ آسماں دیکھا

بہت سے رند بھی دیکھے بہت سے زاہد بھی ۔۔۔ انہیں تو پیر ہمیشہ انہیں جواں دیکھا

یہ جانتے ہیں کہ دل خاک ہو گیا جل کر ۔۔۔ نہ آگ دیکھی نہ اٹھتے ہوئے دھواں دیکھا

بہت ہی روئے گلے مل کے ایک ایک سے ہم ۔۔۔ لٹا ہوا جو کوئی ہم نے کارواں دیکھا

سوئے چمن جو چلے لوٹنے بہار کا لطف ۔۔۔ تو ہم نے دو قدم آگے تجھے خزاں دیکھا

ریاضؔ خاک درِ میکدہ تھا جیتے جی ۔۔۔ فنا کے بعد اسے خلد آشیاں دیکھا

وہی شباب کی باتیں، وہی شباب کا رنگ
تجھے ریاضؔ بڑھاپے میں بھی جواں دیکھا

بادل امڈے ہوئے تھے رات سے میخانے پر
مُہرِ خُم ٹوٹتے ہی، ٹوٹ کے برسے کیا کیا

ہ گہہ پیر شیخ و گاہ مریدِ مغاں رہے ۔۔۔ اب تک تو آبرو سے نبھی ہے جہاں ہو (قائمؔ)

اے جوانی ترے دن رات ٹھہرتے ہی نہیں
جی اُلجھتا ہے مرا شام و سحر سے کیا کیا
کبھی آنچل اُڑے اُن کے کبھی زلفیں بکھریں
وُہ پریشان ہوئے بادِ سحر سے کیا کیا
اَبر کے آتے ہی، تھے حضرتِ ناصح کچھ اور
گرجے کیا کیا یہی ہم پر، یہی برسے کیا کیا
نبھ سکے یہ تو عجب چیز ہے خود داریٔ عشق
ہم کھنچے ہیں تو رگاوٹ ہے ادھر سے کیا کیا

تو اور رہِ شوق اس آہستہ روی سے
اب ساتھ ترا عمرِ رواں ہو نہیں سکتا
میں کون ہوں کیا ہوں، نہیں معلوم کہاں ہوں
مجھ سا کوئی بے نام و نشاں ہو نہیں سکتا
اس شیخِ کُہن سال کی اللہ رے بزرگی
جنّت میں بھی جا کر یہ جواں ہو نہیں سکتا

وُہ ساتھ گئی وقت کے تھی وقت کی جو بات — دیکھا ہے جو ہم نے وُہ سماں ہو نہیں سکتا
ہر راز میں سو باتیں ہیں، ہر بات میں سو راز — افسانۂ دل ہم سے بیاں ہو نہیں سکتا
جو دام اٹھیں حُسن و جوانی کے وُہ کم ہیں — سودا یہ کسی طرح گراں ہو نہیں سکتا

ہم نے بھی ریاضؔ آپ کے اشعار سُنے ہیں
یہ لُطفِ بیاں لطفِ زباں ہو نہیں سکتا

چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی — تصویریں کھینچیں آج تمہارے شباب کی
یہ بھر بُھر بوتلیں ہیں جو شراب کی — راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی
پُوچھو نہ ہم سے عالمِ غفلت کے خواب کی — دنیا کچھ اور ہی تھی ہمارے شباب کی
چھانٹا وُہ دِل کہ جس کی ازل میں نمود تھی — پسلی پھڑک اٹھی نظرِ انتخاب کی
نازک کلائیوں میں حنا بستہ مُٹھیاں — شاخوں میں جیسے منھ بندھی کلیاں گلاب کی
وُہ شام و صبح صدقے ہو جن پر بہارِ گُل — چُن چُن کے ساتھ لائے ہیں راتیں شباب کی

جس دن سے حرام ہوگئی ہے
مے خُلد مقام ہوگئی ہے

قابو میں ہے اُن کے وصل کا دن
جب آئے ہیں، شام ہوگئی ہے

آتے ہی قیامت اس گلی میں
پامالِ خرام ہوگئی ہے

توبہ سے ہماری بوتل اچھّی
جب ٹوٹی ہے جام ہوگئی ہے

کچھ زہر نہ تھی شراب انگور
کیا چیز حرام ہوگئی ہے

مے نوش ضرور ہیں وہ نااہل
جن پر یہ حرام ہوگئی ہے

بجھ بجھ کے جلی تھی قبر پہ شمع
جل جل کے تمام ہوگئی ہے

ہر بات میں ہونٹ پر ہی دشنام
اب حُسنِ کلام ہوگئی ہے

ہے دور ابھی ریاض منزل
دن ختم ہے، شام ہوگئی ہے

تھی فصلِ گُل تو لُطف کی صحبت چمن میں تھی
جو شکل تھی وہ نور کی صورت چمن میں تھی

وارفتہ آج کیسی طبیعت چمن میں تھی
صحرا سے کچھ سوا مجھے وحشت چمن میں تھی

بے دورِ جام باغ میں گذرا تمام وقت
کل ساتھ ساتھ گردشِ قسمت چمن میں تھی

صیاد گھر ترا مجھے جنّت سہی ، مگر
جنّت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

صحرا کی دیکھ بھال بھی کچھ تھی مرے سپرد
تنکے چُنوں چمن کے یہ خدمت چمن میں تھی

اللہ اس طرح کی جُنوں آفریں بہار
جوشِ بہار تھا کہ قیامت چمن میں تھی

کل ہم گئے تھے ، آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گُل ریاضؔ کی تربت چمن میں تھی

عشق میں دل لگی سی رہتی ہے
غم بھی ہو تو، خوشی سی رہتی ہے

یہ ہوا ہے خدا کرے
رات دن بیخودی سی رہتی ہے

اتنی پی ہے کہ بعد توبہ بھی
بے پیئے بیخودی سی رہتی ہے

عیش بھی ہو تو لطفِ عیش نہیں
ہر دم افسردگی سی رہتی ہے

شبِ غم کی سحر میں نور کہاں
صبح بھی شام ہی سی رہتی ہے

یہ نہیں ہے کہ پردہ پڑ جائے
نشّہ میں آگہی سی رہتی ہے

ہو چکی جو دل میں ٹھانی جائے گی
کیا کسی کی بات مانی جائے گی

ڈھل چکی ہے اب جوانی جائے گی
یہ شرابِ ارغوانی جائے گی

تیغ ہی کیا ہاتھ میں قاتل کے تھی
اے حنا تو بھی تو سانی جائے گی

خضر یوں ہی گم رہیں گے عمر بھر
یوں ہی عمرِ جاودانی جائے گی

خدمتِ میخانہ کر لے ورنہ شیخ
رائیگاں یہ زندگانی جائے گی

موت سے بدتر بُڑھاپا آئے گا
جان سے اچھّی جوانی جائے گی

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی
میکدے سے اب پُرانی جائے گی

جان سے بڑھ کر اسے رکھتے عزیز
کیا سمجھتے تھے، جوانی جائے گی

پینے آتے ہیں فرشتہ خوٗ ریاضؔ
حُور کے دامن میں چھانی جائے گی

بس ایک رات کا مہماں شباب ہوتا ہے
غروب صبح کو یہ آفتاب ہوتا ہے

جو ساتھ دے تو یہ دنیا سوا ہے جنّت سے
مزے کی چیز الٰہی شباب ہوتا ہے

خراب ہی سہی رہ جائیں دن جوانی کے
سُنا تو ہے یہ زمانہ خراب ہوتا ہے

ہمارے دیدہ و دل میں سمائے رہتے ہیں
ہمیں سے پردہ، ہمیں سے حجاب ہوتا ہے

تو دِل کا داغ دے، اُٹھے ایسا نہ کیجئے
ہے ڈر کی بات، آگ سے کھیلا نہ کیجئے

کیا جانے بات پہنچے یہ کِس کِس کے کان تک
مجھکو دبی زبان سے کوسا نہ کیجئے

اچھی نہیں یہ آپ کی محشر خرامیاں
دنیا کو اس طرح تہ و بالا نہ کیجئے

بدلا ہے رنگ ایک گلابی نے کس قدر
اب التفات جانبِ مینا نہ کیجئے

کچھ عجب عالم دکھلاتے ہیں کسی کے نقشِ پا
کس نے تصویریں یہ کھینچیں شوخیٔ رفتار کی[ف]

اس کی قدرت جو نہ رکھتے تھے زمیں پر کل قدم
آج انہیں بھی ہے شکایت چرخِ ناہنجار کی

پڑ نہیں سکتا ہے پردہ، ڈالئے پردہ ہزار
چُھپ نہیں سکتیں چھپانے سے نگاہیں یار کی

ف موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی (غالب)

طاعت کا ان بُتوں نے سلیقہ سکھا دیا
خود کیا ملے کہ مجھکو خدا سے ملا دیا

ہیں لاکھ لاکھ دستِ حنائی سے اہتمام
جلتا نہیں چراغ ہمارے مزار کا

یہ نشاطِ زندگانی، یہ شباب یہ جوانی
یہی دن وُہ ہیں کہ جن کا نہیں اعتبار ہوتا

فسردہ دل ہوں، مجھے کیا ہے کوئی موسم ہو
بھری بہار میں کیا تھا جواب خزاں میں نہیں

چھیڑ کیسی، بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاضؔ
اک حسیں ہر وقت ہو ان کے منانے کے لئے

آج بُت بیٹھے ہیں تقدیر کے مالک بنکر　　　اب جو لکھا ہو مقدر ہیں مسلمانوں کے

رُوٹھے ہوئے بھی چھیڑ کے سنتے ہیں میرے شعر
میرے کلام میں ہے مزہ بول چال کا

نظر کے سامنے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے
کہ دل سے دُور ہونا ہے نگہ سے دور ہو جانا
بھرے ساغر میں ہے بھرپور رنگ اُنکی جوانی کا
غضب ہے بے پئے نشّہ میں میرا چُور ہو جانا

سن اور تھا، دن اور تھے کچھ اور تھا عالم　　　اب ہم کو کسی بات کا ارماں نہیں ہوتا

اُس کے آغازِ جوانی کا کہوں کیا عالم
کچھ اُسے نشّہ سا تھا، نشّے میں وُہ چور نہ تھا

شفقِ سرخ کی سج دھج یہ کہے دیتی ہے
کہ جوانی میں حسین کچھ فلکِ پیر بھی تھا

شب بھر رہے کسی سے ہم آغوشیوں کے لطف
ہوتی رہیں قبول دعائیں تمام رات

وُہ بھی کیا وقت ہے ہوتے ہیں شگفتہ جب دِل
وُہ بھی کیا وقت ہے، جب پھول کھلا کرتے ہیں

جنابِ شیخ اُلجھتے ہیں کس تعلّق سے
یہ دُخترِ رز کے کوئی رشتہ دار بھی تو نہیں

بُڑھاپے میں تجھے ہم اے جوانی یاد کرتے ہیں
اب اپنی عمرِ آخر اس طرح برباد کرتے ہیں

کس قدر گورِ غریباں کے ہیں افسردہ چراغ
جس قدر تیز کرو اور بجھے جاتے ہیں

لطف جی بھر کے اُٹھا لیتے ہیں بیباکی کا
ہم تصوّر میں ترے اور مزا پاتے ہیں

نہیں ہم کو لغزش کا ڈر میکدے میں
کہ دو دو فرشتے سنبھالے ہوئے ہیں

چُپ سے ہیں کچھ مری آغوش میں وُہ حشر کے دن
یہ وہی ہیں جنہیں پیمانِ وفا یاد نہیں

باغباں دل میں بھری ہیں تری کیا کیا باتیں
آشیاں جا کے کہیں اور بنا لوں تو کہوں

خوش ہو گئے، ریاضؔ سے بھی ملنا کیا باغ و بہار آدمی ہے

اِن بتوں میں ہیں کچھ ایسے بھی خدا کے بندے
جن کو بگڑی ہوئی تقدیر بنا آتی ہے

نہ آیا ہمیں، عشق کرنا نہ آیا مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا

طُور سے پہلے بھی دیکھا ہے تجھے کان ہیں کچھ آشنا آواز سے

تُم ہو کلیم دیکھنے والوں میں دُور کے — لُوٹے ہیں ہم نے یار کے جلوے قریب سے

شبِ خَلوت کے مزے لاکھ بھرے ہیں اُس میں
بزم میں دیکھ لے دُزدیدہ نظر سے کوئی

آنچل ڈھلا رہا مرے مستِ شباب کا — اوڑھا گیا کبھی نہ دوپٹہ سنبھال کے

کام کچھ چلتا نہیں تدبیر سے — حُسن والے ملتے ہیں تقدیر سے

ہمیں ملے تو کٹے مثلِ خواب آنکھوں میں
مزے کی چیز اگر عمرِ جاوداں کچھ ہے

بگڑ کر کوئی بنتا ہے کوئی بن کر بگڑتا ہے
یہی دُنیا کا نقشہ ہے اسی کا نام دُنیا ہے
بُرے ہوں یا بھلے اچھے ہیں سب میکدے والے
نہ ان کو فکرِ عقبیٰ ہے نہ ان کو فکرِ دُنیا ہے

جب کہہ کے ریاضؔ اُس نے پکارا سرِ محفل
بَن بَن کے کئی آدمی اس نام کے اُٹھے

⁂

مرزا (رسوا)

(۱۸۵۷ء ÷ ۱۹۳۱ء)

مرزا محمد ہادی - ۱۸۵۷ء یعنی ہنگامۂ غدر کے زمانہ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اسی مناسبت سے تمام عمر ایک بیچینی کے عالم میں گذار کر ۱۹۳۱ء میں انتقال کیا۔ بزرگ مغلوں میں سے تھے۔ اور فیض آباد ہوتے ہوئے کسی زمانہ میں آکر لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کے والد آغا محمد تقی عربی، فارسی اور علم الحساب میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ بد قسمتی سے ان کا انتقال مرزا کے لڑکپن ہی میں ہوگیا۔

ابتدائی تعلیم لامارٹینر اسکول لکھنؤ میں حاصل کی۔ اُس کے بعد رڑکی کالج

سے اوورسیبری کا امتحان پاس کر کے ملازمت کرلی۔ کچھ دنوں رائے بریلی میں رہے بیوی اور بچّی کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ کے لئے وطن سے دُور چلے گئے، اور افغانستان سرحدی علاقہ میں بہ سلسلۂ ملازمت قیام کیا۔ آخر لکھنؤ کی کشش واپس کھینچ لائی، اور ریچ مشن اسکول میں مُلازمت کرلی۔ ۱۸۸۲ء اور ۸۴ء کے درمیان علوم مشرقیہ اور انگریزی انٹرنس کے امتحانات پرائیویٹ پاس کئے اور اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں ریڈ کرسچین کالج لکھنؤ میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۴-۱۹۰۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا اور پھر امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے اسی طرح پرائیویٹ امتحان دیکر پی، ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

مرزا کو نئے نئے علوم سیکھنے کا اس قدر شوق تھا اور ذہن اس بلا کا تھا کہ محض اپنے ذاتی مطالعہ سے کیمسٹری، فلسفہ، منطق، تاریخ اور دوسرے علوم میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ حاصل کرلی تھی۔ اگر قدیم زمانہ میں پیدا ہوتے تو یقیناً حکما میں شمار کئے جاتے اور اگر طریق جدید کی پیروی کرتے اور کوئی ایک مضمون انتخاب کر کے اس میں ریسرچ کرتے

تو غالباً دُنیا کے مشاہیر کے گروہ میں شامل ہوتے لیکن افسوس ہے کہ اپنی طبیعت کی وارفتگی کی وجہ سے ایک راستہ پر قائم نہ رہے۔ اور کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر کام نہ کیا۔ اس کو وُہ اپنی کاہلی کہتے تھے۔

کاہلی سے ہیں ہوا عالمِ امکاں میں خراب
تھا مرے بخت میں کیا جانئے کیا ہو جانا

یہی حال ان کی شاعری اور ناول نگاری کا تھا۔ اکثر کتابیں مالی مشکلات کے تحت نہایت عجلت میں لکھّیں اور کوڑیوں کے مول فروخت کر ڈالیں۔ غالب کی طرح یہ بھی شراب کے عادی تھے اور تنخواہ میں گذارہ نہ ہو سکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ "امراؤ جان ادا" پچھتّر روپئے میں بکی تھی۔ "شریف زادہ" سو روپیہ میں۔ "مرقع لیلیٰ مجنوں" پچیس روپئے میں اور مثنویاں اس سے بھی کم قیمت میں۔ ان حالات میں مرزاؔ کے ادبی کارنامے اُن کی انتہائی کوشش کا نتیجہ نہیں تھے۔ اور واقعی اگر وُہ توجہ اور مشقّت سے لکھتے تو معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہونچتے۔ پھر بھی "امراؤ جان ادا"

اُردو زبان کا بہترین ناول مانا جاتا ہے، اور "مرقعِ لیلیٰ مجنوں" جس سے افسوس ہے کہ بہت کم لوگ واقف ہیں۔ نظمیہ ڈرامہ کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ "مثنوی امید و بیم" اور "مثنوی نو بہار" میں فلسفیانہ مضامین کو شاعری کا جامہ پہنایا ہے اور ان کا بھی جواب نہیں۔ غزلیں جن کا نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اکثر مرزا غالبؔ کے انداز میں لکھی گئی ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ کسی دوسرے شاعر سے غالبؔ کی پیروی اتنی کامیابی کے ساتھ آج تک نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دونوں مرزا فلسفیانہ طبیعت، آزادانہ رنگ اور بلند اخلاق کے ساتھ ساتھ رندانہ انداز رکھتے تھے اور جدتِ طبع پر ناز کرتے تھے ؎

کہیں ایسے بھی کچھ اشعار مرزا جن میں جدت ہو
کہاں تک حاشئے لکھا کریں غالبؔ کے دیواں پر

تو نے مرزا شاعری کا نام روشن کر دیا
اک زمانہ تھا یہ اندازِ سخن بھولا ہُوا

دنیا کے اکثر صاحب کمالوں کے کردار میں بڑی بڑی کمزوریاں پائی گئی ہیں۔ ان پر افسوس کرنا عبث ہے۔ اس لئے کہ ان خصوصیّات کے بغیر یہ حضرات کوئی دوسرے ہی ہوتے، یہی حال مرزا رسوا کا ہے ؎

بُرے ہیں ہم مگر ایسے بُرے بھی کم ہونگے
کسی زمانے کے اچّھے ہیں کریں گے یاد

مرزا کا دیوان کبھی نہیں چھپا، اور کلام بھی اب نایاب ہے۔ کسی زمانہ میں لکھنؤ کے "رسالۂ ناول" میں ایک مختصر مجموعہ چھپا تھا۔ اُس میں سے یہ انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

جامِ صہبائے کہن یاد آیا — ساقیِ عہد شکن یاد آیا
مُنحصر موت پہ ہے کارِ جنوں — پھر گریبانِ کفن یاد آیا
دیکھ کر طرزِ غزالانِ خُتن — حالِ یارانِ وطن یاد آیا
وُسعتِ عیش سے بیزار ہی دل — دشتِ غُربت میں وطن یاد آیا

جوشِ رقّت سے ہی تر دامنِ شوق
گریۂ شمعِ لگن یاد آیا

خفا نہ ہو جو مرا دل جلا ہوا پایا — ہزار شکر کہ شعلہ بجھا ہوا پایا
سُراغِ منزلِ مقصد ملا نہ ہستی سے — یہ نقش پہلے ہی ہم نے مِٹا ہوا پایا
ہر اک روانیٔ عمرِ رواں کا قائل ہے — مگر زمانہ کو اس نے رُکا ہوا پایا
نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دل آویزی — تمام عمر کا قِصّہ لکھا ہوا پایا
سببِ مسرتِ پنہاں کا کچھ نہ کھلتا تھا
ترے خیال کو دل میں چھپا ہوا پایا

ہے محبت سے پشیماں دلِ مضطر کیا کیا — طعنے دے دیکے لگاتا ہوں ہیں نشتر کیا کیا
اُن کی محفل سے بگڑ کر جو چلا آیا ہوں — مجھ کو سمجھاتا ہے میرا دلِ مضطر کیا کیا

للہ الحمد قناعت بھی توکّل بھی ہے — تیری سرکار سے پایا عوضِ زر کیا کیا

نامہ بر ہم نے جو بھیجا نہ وُہ آیا پھر کے — یوں تو آئے تری جانب سے پیمبر کیا کیا

تجھ سے ملنے کی تمنا غمِ جاوید کی فکر — آدمی کو بھی خیال آتے ہیں اکثر کیا کیا

اک تصوّر ترا اور سیکڑوں ارمان مرے — دلِ مضطر میں بپا رہتے ہیں محشر کیا کیا

دستِ نازک میں پہونچتا جو مرا خط مرزا
ناز کرتا رگِ گُل پر خطِ مسطر کیا کیا

حسرتوں پر کسی صورت سے نہ قابو ہوتا — دل نہ ہوتا مرے پہلو میں اگر تو ہوتا

برق کی اے دلِ بیتاب ضرورت کیا ہے — آسماں پر بھی تڑپنے کے لئے تو ہوتا

شب کو محفل میں تمہیں نیند جہاں آئی تھی — یہ بھی ممکن تھا کہ میرا ہی وُہ پہلو ہوتا

شرطِ انصاف ہے دونوں ہیں برابر بیتاب — جگر و دل میں کوئی تیر ترا زُو ہوتا

بھیجتا میں ترے کوچہ میں صبا کے ہمراہ — اُڑ کے چہرے سے اگر رنگ مرا بُو ہوتا

لطفِ بیانِ حسرت و ارماں نہیں رہا　　　اگلا وُہ رسم اے دلِ ناداں نہیں رہا
تاثیر اور جذب کے قابل تھے ہم کبھی　　　لیکن وُہ اعتقاد وُہ ایماں نہیں رہا
ناصح سے ہیں جہاں کی پریشانیوں کے ذکر　　　گویا خیالِ زلفِ پریشاں نہیں رہا
اک بُت کا ہے یہ قول کہ مرزاؔ سوا ترے
دُنیا میں اور کوئی مسلماں نہیں رہا

دل لگا کر ہوا زیاں اپنا　　　نہ ہوا دل نہ دلستاں اپنا
کم نہیں ہے وُہ مہرباں اپنا[1]　　　کیوں ہوا دشمن آسماں اپنا
کیا لگائے گا وُہ پتہ تیرا　　　جس کو ملتا نہیں نشاں اپنا
دل نے کیوں اُسکی پاسداری کی　　　تھا یہ کمبخت رازداں اپنا

[1] یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے　　　ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو
(غالب)

اے قفس تجھ کو کس طرح پھونکوں　　یاد آتا ہے آشیاں اپنا
دیکھ اے دل، کمی نہ کرنا تو　　ہے غمِ یار میہماں اپنا
لاکھ اہلِ زباں ہوں اے مرزا
نہ ملا کوئی ہم زباں اپنا

اثر ہوتا اگر آہ و فغاں میں　　کوئی عاشق نہ ملتا اس جہاں میں
ستم سیکھو، دل آزاری نہ سیکھو　　رہے کچھ فرق تم میں آسماں میں
نہ منھ کھولو ابھی بزمِ سخن میں　　اثر پیدا کرو اپنی زباں میں
کہاں تک اگلے مضمونوں کی تکرار　　ترقّی چاہیئے کچھ تو بیاں میں
دلِ مایوس میں اب کیا رہا ہے　　چمن کی سیر کرتے ہو خزاں میں
خدا جانے یہ کیا کچھ کر گذرتا　　اثر ہوتا جو ناصح کی زباں میں
نہ اُٹھیں گی اگر وہ نیچی نظریں　　تو بگڑے گی زمین و آسماں میں

ہمیں نے کی وفاداری زیادہ | ہمیں بدنام ہیں سارے جہاں میں
وہی تھا میری قسمت کا ستارہ | پتہ جس کا نہیں اب آسماں میں
مری ہمت بڑھی جاتی ہے آگے | مگر ہوں سب کے پیچھے کارواں میں

کسی کا دل نہ رنجیدہ ہو مرزا
یہ بے لُطفی نہ ہو طرزِ بیاں میں

٭

اطوار ترے اہلِ زمیں سے نہیں ملتے | انداز کسی اور حسیں سے نہیں ملتے
اے حضرتِ دل ان سے بنی ہے نہ بنے گی | کیوں آپ کسی اور حسیں سے نہیں ملتے
اُن کی بھی بہرحال گذر جاتی ہیں راتیں | جو لوگ کسی زہرہ جبیں سے نہیں ملتے
گُم کر کے فلک جن کو پشیمان بہت ہے | وہ گوہرِ نایاب زمیں سے نہیں ملتے
تم مہر سہی، ماہ سہی، ہم سے ملو تو | کیا اہلِ فلک اہلِ زمیں سے نہیں ملتے

مرزا کو بھی پروا نہیں والا منشوں کی
اچھا ہے جو اس خاک نشیں سے نہیں ملتے

ابر جب جُھوم جُھوم کر آئے دل جو اُمنڈے ہوئے تھے بھر آئے

آنکھ کو دیکھنا اگر آئے ہر طرف تو ہی تو نظر آئے

ستم ایسا نہ کر کہ دل کی بات دل سے نکلے، زبان پر آئے

دل میں طوفاں اٹھاتے تھے نالے لب تک آئے تو بے اثر آئے

جس کو برسوں ہنسی نہ آتی ہو ناصحا تیری بات پر آئے

سُن کے اشعار میرے اے مرزاؔ
لوگ تُربت پہ نوحہ گر آئے

یادگارِ عیشِ رفتہ ہے مری پژمُردگی اس طرح ہوں جیسے کوئی پھول مُرجھایا ہوا

آمدِ پیری سے ہیں مرزاؔ اُداس کارخانہ عیش کا برہم ہوا

دیکھنا چاہیئے انجامِ طلسمِ امکاں　　ابھی باقی ہے یہاں حشر کا ساماں ہونا

کس طرح وُہ سمجھیں گے الٰہی مرے دل کی
ہے میری زباں اور فرشتوں کی زباں

کس کے جلوے نے سکھائی یہ زیادہ طلبی
مُطمئن دونوں جہاں لے کے بھی انساں نہ ہوا

جینے[1] کا مزا کیا جو میسّر نہ ہو مرنا　　کیا لطف جو لبریز نہ ہو جام کسی کا

رفتارِ زمانے کی بدلنے کو ہے مرزاؔ　　شاید اِسی صُورت سے چلے کام کسی کا

---

[1] نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا (غالب)

شماتت نکتہ چیں کی نازِ بیجا قدر دانوں سے
یہ قسمت اُن کی ہے حصہ میں جن کے شعر کا فن ہو
بہت خوش ہیں ہم اپنے دل میں مرزا نکتہ چینی سے
مگر ہاں شرط یہ ہے، نکتہ چیں بھی ماہرِ فن ہو

تکلّف نہ ہو شعر کہنے میں کچھ　　نکل آئیں سانچے میں ڈھلتے ہوئے

⁂

اقبال

(۱۸۷۵ء ÷ ۱۹۳۸ء)

ڈاکٹر سر محمد اقبال، سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ بزرگ کشمیر سے آئے تھے۔ مشرق و مغرب کے فلسفہ کے علوم کے اعلیٰ مدارج انگلستان اور جرمنی میں طے کئے۔ اقبال نے اپنے علم و دانش سے بھی اسی قدر شہرت حاصل کی جتنی اپنی شاعری سے، ان کا مرتبہ جدید اسلامی دنیا کی تاریخ میں بہت بلند ہے۔ عالم فلسفی، شاعر اور روشن خیال رہبرِ قوم تھے۔

فنِ شاعری میں اقبال داغ کے شاگرد تھے۔ ابتدائی کلام میں استاد کے رنگ

کی جھلک نظر آتی ہے۔ رفتہ رفتہ اپنا علیحدہ طرز اختیار کیا جس کی خوبیوں سے سب واقف ہیں۔ مرزا غالب کی طرح اقبال کا فارسی کلام بھی اُن کی اردو شاعری سے بلند تر خیال کیا جاتا ہے۔ دقیق فلسفیانہ مضامین خوب صورت بندشوں اور استعاروں کے ساتھ نہایت خوبی سے بیان کئے ہیں۔ غالب ہی کی طرح اقبال کی شاعری پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ ادیب، عالم اور شاعر سب ہی اس مجموعۂ کمالات کو خراجِ عقیدت پیش کر چکے ہیں ؎

دعویٰ علم و خرد میں جوش تھا اکبر کو رات — ہو گیا ساکت مگر جب ذکرِ اقبال آ گیا

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا
گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھُپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہو گا

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وُہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے، خوار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو خُدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وُہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

سفینۂ برگ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری، تو پھر کسے اعتبار ہوگا

کہا جو قمری سے میں نے اک دن، یہاں کے آزاد پابہ گِل ہیں
تو غنچے کہنے لگے، ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ رسم بزمِ فنا ہے اے دل گناہ ہے، جنبشِ نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری، جو تو یہاں بیقرار ہوگا

میں ظلمتِ شب میں لیکے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانہ، ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ رہگذار بیٹھا، ستم کشِ انتظار ہوگا

انوکھی وضع ہے، سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے، یارب، رہنے والے ہیں

علاجِ دردمیں بھی درد کی لذّت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری اُمیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

رُلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا، نرالے میرے نالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذّت، خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھّی، رفیق راہ منزل سے
ٹھہر جا، اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبالؔ کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وُہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

اگر کچھ آشنا ہوتا مذاق جبہ سائی سے
تو سنگِ آستانِ کعبہ جا ملتا جبینوں میں

کبھی اپنا بھی نظّارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے[1] وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جُدائی کی گذرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

چھُپایا حُسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفَس اُن کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

---

[1] ایامِ مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے   دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے (شہیدی)

تمنا دردِ دل کی ہو تو خدمت کر فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ اِن کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وُہ رونق انجمن کی ہے انھیں خلوت گزینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

محبّت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وُہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

سراپا حُسن بن جاتا ہے جس کے حُسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے مَا عَرَفْنَا پر
ترا رُتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

خموش اے دل، بھری محفل میں چلّانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے مُحبّت کے قرینوں میں

بُرا سمجھوں اُنہیں مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنّت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سُنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں ای اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بُجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہدی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں تارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، اُفتادگی تیرے کنارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چھُپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

جو ہے بیدار انساں میں، وُہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

مُجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ مُحبّت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں، میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

سکوں نا آشنا رہنا اسے سامانِ ہستی سے
تڑپ کس دل کی یا رب چھپ کے آبیٹھی ہے پارے میں

صدائے لَن ترانی سُن کے اے اقبال میں چُپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مُجھ فرقت کے مارے میں

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طَرَب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وُہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وُہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وُہ حُسن میں رہیں شوخیاں
نہ وُہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وُہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

بہ زمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد ۔۔۔ کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی (عراقی)

نہ آتے، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا اس میں، بندے کی، سرکار کیا تھی
بھری بزم میں، اپنے عاشق کو تاڑا — تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامّل تو تھا، اُن کو آنے میں، قاصد — مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی
کھنچے خود بخود جانبِ طورِ موسیٰ — کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی

کہیں ذکر رہتا ہے اقبالؔ تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

یہ سرودِ قمری و بلبل فریبِ گوش ہے — باطنِ ہنگامہ آبادِ چمن خاموش ہے
تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مئے مغرب اثر — خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن بے ہوش ہے
دہر کے غم خانہ میں تیرا پتہ ملتا نہیں — جرم تھا کیا آفرینش بھی کہ تو روپوش ہے
آہ! دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں — پہلوئے انساں میں اک ہنگامۂ خاموش ہے

زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل　　یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بارِ دوش ہے

جس کے دم سے دِلّی و لاہور ہم پہلو ہوئے
آہ اے اقبالؔ وہ بلبل بھی اب خاموش ہے

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظّارہ کی ہوس ہے تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے
واعظ کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈھ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
بُت خانہ بھی حرم بھی، کلیسا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنّا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جینا وُہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبالؔ کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

آصغر

(۱۸۸۴ء تا ۱۹۳۶ء)

اصغر حسین، گونڈہ کے رہنے والے تھے۔ آصغر کے کلام کی رنگینی اور نازک خیالی بعض اوقات مومن کی یاد تازہ کرتی ہے، اور یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں اسلئے کہ امیر اللہ تسلیم کے شاگرد تھے ؎

آصغر غزل میں چاہئے وُہ موجِ زندگی
جو حُسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

صوفی منش انسان تھے۔ کلام میں بھی تصوّف کا رنگ غالب ہے۔ لیکن

ان کا اندازِ بیان نرالا ہے۔ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص تازگی و لطافت اِن کے صوفیانہ کلام کو اکثر دلفریب بنا دیتی ہے۔ عاشقانہ اشعار میں بھی بڑی حد تک یہی خصوصیت نظر آتی ہے۔ جن لوگوں کو اصغرؔ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے وُہ ان کی مسکراتی ہوئی سنجیدگی کا آج تک دم بھرتے ہیں ؎

جسے لینا ہو آکر اس سے اب درسِ جنوں لے لے
سُنا ہے ہوش میں ہے اصغرؔ دیوانہ برسوں سے

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی — جلوؤں کے اژدھام نے حیراں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی — یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
کچھ شورشوں کی نذر ہوا خونِ عاشقاں — کچھ جم کے رہ گیا اسے حرماں بنا دیا
اے شیخ وُہ بسیط حقیقت ہے کفر کی — کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی
جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے
ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

بلبل بہ آہ و نالہ و گل مستِ رنگ و بو
مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

کہتے ہیں اک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

عالم سے بیخبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

اس حسن کاروبار کو مستوں سے پوچھئے
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا

میخانۂ ازل میں جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

اس رُخ پہ ہے نظر کبھی جامِ شراب میں
آیا کہاں سے نورِ شبِ ماہتاب میں

اقلیمِ جاں میں ایک تلاطم مچا دیا
یوں دیکھئے تو کچھ نہیں تارِ رباب میں

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

وُہ برق رنگ خرمنِ جاں کیلئے کہاں
مانا کہ بوئے گل تو ملے گی گلاب میں

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں
بکھرا دئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

اب کون تشنگانِ حقیقت سے یہ کہے
ہے زندگی کا راز تلاشِ سراب میں

میں اس ادائے مست خرامی کو کیا کہوں
میری نظر تو غرق ہے موجِ شراب میں

آصغر غزل میں چاہئے وُہ موجِ زندگی
جو حُسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں

اے تو بہار رنگ رنگ اے تو ورائے آب و رنگ
عشق کسی نگاہ میں حسن کسی نگاہ میں

حسنِ ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے
ملحدِ باخبر بھی گم جلوۂ لاالٰہ میں

در پہ جو تیرے آ گیا اب نہ کہیں مجھے اٹھا
گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب نہ زمیں نہ آسماں
تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں

رازِ فتادگی نہ پوچھ لذتِ خستگی نہ پوچھ
ورنہ ہزار جبرئیل چھپ گئے گردِ راہ میں

لفظ نہیں بیاں نہیں یہ کوئی داستاں نہیں
شرحِ نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں

نمایاں کر دیا اُس نے بہارِ روئے خنداں کو
کہ دی نغمے کو مستی رنگ کچھ صبحِ گلستاں کو
ذرا تکلیفِ جنبش دے نگاہِ برق ساماں کو
جہاں میں منتشر کر دے مذاقِ سوزِ پنہاں کو

ذرا رو کے ہوئے موجِ تبسم ہائے پنہاں کو
ابھی یہ لے اُڑیں گی بجلیاں تارِ رگِ جاں کو
قفس ہو دام ہو کوئی چھڑائے اب یہ ناممکن
ازل کے دن کلیجے میں بٹھایا تھا گلستاں کو
بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا
کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو
تمنا ہے نکل کر سامنے بھی عشوہ فرما ہو
کوئی دیتا ہے جنبش پردۂ بے تابیٔ جاں کو
یہاں کچھ نخل پر بکھرے ہوئے اوراقِ رنگیں ہیں
مگر اک مشت پر سے پوچھئے رازِ گلستاں کو
دکھائی صورتِ گل پر بہارِ شوخیٔ پنہاں
چھپایا معنیٔ گل میں کبھی حسنِ نمایاں کو

ہوئے جو ماجرے خلوت سرائے راز ہیں اس سے
نہ کفر اب تک ہوا واقف خبر اس کی نہ ایماں کو
سُنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو
نہ میں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھ کو ذوقِ عُریانی
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

ذرّوں کا رقص مستیٔ صہبائے عشق ہے — عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے
بیٹھا ہے ایک خاک نشیں محوِ بیخودی — کچھ حُسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے
ہیجان و اضطراب ہے امّیدِ وصل ہے — رازِ حیات شورشِ بیجائے عشق ہے
ہر عشوۂ حجاب، طریقِ نمودِ حُسن — ہر حرفِ شوق پردۂ اخفائے عشق ہے
اب خود یہاں تغافل و بیگانگی سی ہے — کچھ یہ بھی طرفہ کارئی سودائے عشق ہے

جب یہ نہیں تو ختم ہیں رنگینیاں تمام ساز خودی میں جوشِ نواہائے عشق ہے

کس درجہ ایک خاک کے ذرّہ میں ہے تپش
ارض و سما میں شورش و غوغائے عشق ہے

شکوہ نہ چاہئے کہ تقاضا نہ چاہئے جب جان پر بنی ہو تو کیا کیا نہ چاہئے
ساقی تری نگاہ کو پہچانتا ہوں میں مجھ سے فریبِ ساغرو مینا نہ چاہئے
یہ آستانِ یار ہے صحنِ حرم نہیں جب رکھ دیا ہے سر تو اٹھانا نہ چاہئے
خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے اہلِ تپش کو آتشِ سینا نہ چاہئے
کیا کم ہیں ذوقِ دید کی جلوہ طرازیاں آنکھوں کو انتظار تماشا نہ چاہئے
وہ بارگاہِ حسن ادب کا مقام ہے جز درد و اشتیاق تقاضا نہ چاہئے
تیغِ ادا میں اس کے ہے اک روحِ تازگی ہم کشتگانِ شوق کو مرنا نہ چاہئے
ہستی کے آب و رنگ کی تعبیر کچھ تو ہو مجھ کو فقط یہ خوابِ زلیخا نہ چاہئے

اس کے سوا تو معنیٔ مجنوں بھی کچھ نہیں
ایسا بھی ربطِ صورتِ لیلیٰ نہ چاہئے

ٹھہرے اگر تو منزلِ مقصود پھر کہاں
ساغر بکف گرے تو سنبھلنا نہ چاہئے

اک جلوہ خال و خط سے بھی آراستہ سہی
واماندگیٔ شوقِ تماشا نہ چاہئے

سب اہلِ دید بیخود و حیران و مست ہیں
کوئی اگر نہیں ہے تو پردا نہ چاہئے

اصغرؔ صنم پرست سہی پھر کسی کو کیا
اہلِ حرم کو کاوشِ بیجا نہ چاہئے

ستم کے بعد اب اُن کی پشیمانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اسقدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

پتہ ملتا نہیں اب آتشِ وادیٔ ایمن کا
مگر مینائے مے کی نور افشانی نہیں جاتی

مگر اک مشتِ پر کی خاک سے کچھ ربط باقی ہے
ابھی تک شاخِ گُل کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو
مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

اُڑا دیتا ہوں اب بھی تارتارِ ہست و بود اصغرؔ
لباسِ زہد و تمکیں پر بھی عُریانی نہیں جاتی

خدا جانے کہاں ہے اصغرؔ دیوانہ برسوں سے
کہ اس کو ڈھونڈتے ہیں کعبہ و بُت خانہ برسوں سے

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے نہ جل کر خاک ہونا ہے
یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

کوئی ایسا نہیں یارب کہ جو اس درد کو سمجھے
نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

کبھی سوزِ تجلّی سے اسے نسبت نہ تھی گویا
پڑی ہے اس طرح خاکسترِ پروانہ برسوں سے

ترے قربان ساقی اب وہ موجِ زندگی کیسی
نہیں دیکھی ادائے لغزشِ مستانہ برسوں سے

مری رندی عجب رندی مری مستی عجب مستی
کہ سب ٹوٹے پڑے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

حسینوں پر نہ رنگ آیا نہ پھولوں میں بہار آئی
نہیں آیا جو لب پر نغمۂ مستانہ برسوں سے

کھلی آنکھوں سے ہوں حسنِ حقیقت دیکھنے والا
ہوئی لیکن نہ توفیقِ درِ بت خانہ برسوں سے

لباسِ زہد ہو پھر کاش نذرِ آتشِ صہبا
کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأتِ رندانہ برسوں سے

جسے لینا ہو آ کر اس سے اب درسِ جنوں لے لے
سُنا ہے ہوش میں ہے اصغرِ دیوانہ برسوں سے

⁘

آرزو

(۱۸۷۲ء ÷ ۱۹۵۱ء)

سید انور حسین، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ جلال کے شاگرد اور جانشین تھے عربی و فارسی کی اعلیٰ استعداد کے علاوہ فنِ عروض و قافیہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور اس مضمون پر کئی کارآمد رسالے لکھے ہیں۔ زبان کی صحت کے لحاظ سے آرزو کا کلام مستند خیال کیا جاتا ہے۔

ثقہ و پرہیزگار انسان تھے۔ دنیا سے نباہ نہ کرسکے اور افسوس ہے کہ باوجود اپنے کمالات کے ہمیشہ پریشانیوں میں بسر کی۔ سالہا سال تھیٹر اور سنیما کمپنیوں کے لئے

ڈراما نویسی کا کام کیا۔ لیکن دنیا داری نہ جاننے کے باعث ان سے جتنا معاوضہ حاصل کرنا چاہیئے وُہ نہ وصول کر سکے۔

آرزو کے کلام کی مخصوص صفت سادگی اور اثر ہے۔ اکثر چھوٹے چھوٹے فقرے آسان الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں اور ان سے پورا کام لیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں رنگین عاشقانہ مضامین بہت کم ہیں۔ اکثر ناکامی، حسرت ویاس کے تذکرے ہیں۔ یہ ان کی اُفتادِ طبیعت اور حالاتِ زمانہ کا اثر ہے ؎

آرزو تھا اک اندھیرے کا چراغ
اسکی بھی اب ضوفشانی ختم ہے

دل جن کا گیا ہے رنج انہیں جو پا گئے ہیں خوش ہوتے ہیں
یہ اپنی اپنی قسمت ہے وُہ ہنستے ہیں ہم روتے ہیں

کھو سکتی ہے کیا کوئی غفلت دیدِ رخ جاناں کی حسرت
دیکھے کوئی ان کی محویّت جو کھول کے آنکھیں سوتے ہیں

اُلفت میں نظر یہ کس کی لگی حاصل نہ ہوئی پھر سرسبزی
گردوں سے گری جن پر بجلی وُہ درخت ہرے کب ہوتے ہیں

اے آرزوئے وصلِ جاناں بستر پہ اکیلے نیند کہاں
کٹ جاتی ہے رات آنکھوں میں یہاں اور سونے والے سوتے ہیں

پھر کیا تھا جو دل میں خوف نہ تھا عاشق کے خونِ ناحق کا
کیا شان میں دھبہ لگتا ہے دامن سے جو داغ وُہ دھوتے ہیں

بس آرزو اب خاموش رہو ہوتی ہے جو کچھ بیداد سہو
شکوہ نہ کرو منہ سے نہ کہو معشوق سب ایسے ہی ہوتے ہیں

جاگتے گذری نہ سوتے گذری ہجر کی مدت روتے گذری
خاک میں خاک نہ مل لی جب تک آنسوؤں سے منہ دھوتے گذری
رات مزے کی اور یہ غفلت ساری جوانی سوتے گذری

غم کی مرے کیا قدر ہو اس کو　　　عمر جسے خوش ہوتے گذری
آرزو اک اُمّید لگا کر
پاس ہی سے کچھ کھوتے گذری

یہ اچانک کدھر نگاہ گئی　　　ساتھ دل سے نکل کے آہ گئی
پیریِ اچھّی شباب و طفلی سے　　　کہ بُرے حال میں نباہ گئی
کیا بلا تھی یہ انتظار کی رات　　　شمع گُل کر کے روسیاہ گئی
کوئی بجلی تھی لہر گیسو کی　　　کہ جھلک دیکھتے نگاہ گئی
آرزو جام لو جھجک کیسی
پی لو اور دہشتِ گناہ گئی

عیش والوں سے غریبی کی مصیبت نہ کہو　　　زخم کی طرح ہنسو درد کی حالت نہ کہو

بھید کھلتا ہے بھرم جاتا ہی ہوتی ہی ہنسی
جس سے حرف آئے نہیں پر وہ حکایت نہ کہو

صبر کڑوا ہے مگر صبر کا پھل میٹھا ہے
بھیس بدلی ہوئی راحت کو اذیت نہ کہو

آرزو اپنے ہی منہ سے ہے خود اپنی توہین
شرم عزّت کی اگر ہو تو مصیبت نہ کہو

بھولے بن کر حال نہ پوچھو بہتے ہیں اشک تو بہنے دو
جس سے بڑھے بے چینی دل کی ایسی تسلّی رہنے دو

رسمیں اس اندھیر نگر کی نئی نہیں یہ پرانی ہیں
مہر پہ ڈالو رات کا پردہ ماہ کو روشن رہنے دو

روح نکل کر باغ جہاں سے باغِ جناں میں جا پہنچے
چہرے پہ اپنے میری نگاہیں اتنی دیر تو رہنے دو

خندۂ گُل بُلبل میں ہوگا گُل میں نغمہ بلبل کا
قصہ ایک زبانیں دو ہیں آپ کہو یا کہنے دو

اپنا جنونِ شوق دیا کیوں خوف جو تھا رسوائی کا
بات کرو خود قابلِ شکوہ اُلٹے مجھ کو کہنے دو

آگئی پیری جوانی ختم ہے — صبح ہوتی ہے کہانی ختم ہے
حسرتوں کا دل سے قبضہ اُٹھ گیا — غاصبوں کی حکمرانی ختم ہے
ہو گیا ذوقِ نظارہ خود فنا — یا بہارِ بوستانی ختم ہے
ماجرائے غم چراغِ صبح کا — ختم اور اپنی زبانی ختم ہے
صورتِ یخ بستہ ہے جوشِ گداز — بہتے دریا کی روانی ختم ہے
ذکرِ غم ہیں لذّتِ غم پھر کہاں — اپنے ساتھ اپنی کہانی ختم ہے

آرزو تھا اک اندھیرے کا چراغ
اُس کی بھی اب ضو فشانی ختم ہے

بجھے جی کا اگلا سا جلنا کہاں اب — دھواں سا تو ہے، پو نکلنا کہاں اب

وہ ہر آنے والے پہ دھوکا انہیں کا — وہ گھبرا کے گھر سے نکلنا کہاں اب

رہا کرتا ہے جی بھی ڈوبا ہوا سا — وہ ہاتھوں کلیجہ اچھلنا کہاں اب

پڑے رہتے ہیں یوں ہی منہ کو لپیٹے — وہ اٹھ اٹھ کے پہروں ٹہلنا کہاں اب

للک ہو کسی کی تو ہوکیں بھی اٹھیں — تڑپ کر وہ کروٹ بدلنا کہاں اب

لگی تک تھا سب کا لگانا بجھانا — جلانا کہاں اب ہے جلنا کہاں اب

اٹھا اور گرا آرزو اس گلی میں
نہیں پاؤں جمتے سنبھلنا کہاں تک

ہو گئیں کیاریاں ہری، جیسے کہ رت پلٹ چلی

کون یہ مسکرا دیا، ہنسنے لگی کلی کلی

کھلنے کی آس میں یہاں ڈال گئے تھے اک کلی

رو کے اٹھا رہے ہیں آج پنکھڑیاں کلی دلی

تاروں کو دیکھتے ہیں سب، اور میں دیکھتا ہوں یہ

آئی کہاں سے یہ چمک، کس کی ہے یہ جھلاجھلی

دن کی بھی آس ہے یہاں رات کی مگر چاندنی

کتنی رتیں پلٹ گئیں، ڈال کبھی نہ یہ پھلی

اس کے لئے کہ آرزو ہنستا ہوا تھا ساتھ تھے

ڈھونڈ تھکا ہوں بن کے بن چھان پھرا گلی گلی

٭

دُکھ روگ کو چاہت کے سُکھ روگ بنانا ہے

دہکا ہوا انگارہ چھاتی سے لگانا ہے

کھسیانی ہنسی ہنسنا اک بات بنانا ہے

ٹپکے ہوئے آنسو کو پلکوں سے اٹھانا ہے

جو آپ سے گذرا ہے پہنچا ہے وہی تجھ تک

جو آپ کو بھولا ہے اُس نے تجھے جانا ہے

ہم یوں ہی نہیں چپ ہیں کیوں چپ ہیں نہ یہ پوچھو
بات اپنی بنانا ہے بھید اُن کا چھپانا ہے

اُٹھنا تری چوکھٹ سے اور سوچ کے یہ رُکنا
جائیں تو کدھر جائیں پچھتا کے پھر آنا ہے

ہاں آرزو اچھا ہے جو اور بھی دُکھ جھیلو
سمجھایا ہے جب تم کو کہنا نہیں مانا ہے

⁂

دفعتہً ترکِ تعلّق میں بھی رسوائی ہے
اُلجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دیکر

⁂

تجربے سب ہیچ ہیں قانون سب بیکار ہیں
ہر زمانہ اک نیا پیغام لے کر آئے ہے

⁂

حسرت

(۱۸۷۵ء تا ۱۹۵۱ء)

سید فضل الحسن، موہان، لکھنؤ کے قریب ضلع اناؤ میں ایک قصبہ ہے وہاں پیدا ہوئے۔ علی گڈھ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ شاعری میں تسلیم کے شاگرد تھے۔ مومن اور نسیم دہلوی کے شیدائی۔ ان کے کلام میں نازک خیالی، زبان کی دلکشی، سادہ پُراثر عاشقانہ و صوفیانہ مضامین خوبصورت فارسی ترکیبوں کے ساتھ، غرض کہ طرز دہلی اور لکھنؤ دونوں کی خوبیاں پائی جاتی ہیں ؎

ہے زبان لکھنؤ میں طرزِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہوگیا

طرزِ مومن میں مرحبا حسرت
تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

سیاسی میدان میں ایک عرصہ تک کانگریس کے ساتھ رہے اس کے بعد مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ قوم کے سچے ہمدرد اور اس کے لئے بخوشی جان و مال کی قربانی کرنے والوں میں سے تھے۔ جفاکش، سچے، ایماندار عجیب فرشتہ خصلت انسان تھے۔

حسرت موہانی کانپور سے رسالۂ اردوئے معلّٰی نکالتے تھے جس میں پرانے شعرا کے کلام کا انتخاب چھاپتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر قابلِ قدر تنقیدی مضامین لکھ کر شائع کئے۔ غرض کہ باوجود اپنی سیاسی مصروفیتوں کے ادب اور شاعری کی خدمتوں میں بھی اسی قدر منہمک رہتے تھے ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقّت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

نظر پھر نہ کی اُس پہ دل جس کا چھینا — محبت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا
وُہ کیا قدر جانیں دلِ عاشقاں کی — نہ عالم، نہ فاضل، نہ دانا نہ بینا
یہ کیا کفرِ نعمت ہے اے شیخ آخر — کہ برسات میں بھی پلانا نہ پینا
وہیں سے یہ آنسو رواں ہیں جو دل میں — تمنّا کا پوشیدہ ہے اک خزینا
بہا دیں وہاں خون اپنا، جہاں ہم — ترے حُسن کا گرتے دیکھیں پسینا
یہ کیا قہر ہے ہم پہ یارب کہ بے مے — گذر جائے ساون کا یوں ہیں مہینا
بہار آئی سب شادماں ہیں مگر ہم — یہ دن کیسے کاٹیں گے بے جام و مینا
جدا جب کہ ہیں تجھ سے اے راحتِ جاں — ہمارا برابر ہے جینا نہ جینا

مٹے عیب سب عشق بازی میں حسرت
نہ بغض و حسد ہے نہ غصّہ نہ کینا

ترے حسن کا دور دورا رہے گا — نہ میرا یہ جوشِ تمنّا رہے گا

مگر سالہا سال بعد فنا بھی | زمانے میں دونوں کا چرچا رہے گا
نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی (ق) نہ حکّام کا جورِ بے جا رہے گا
زمانہ وُہ جلد آنے والا ہے جس میں | کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہے گا
یہ سب لیکے مال و دل و جان و ایماں | ترا پھر بھی ہم پر تقاضا رہے گا
مرے شوق کا ہے جو مضطر ابھی سے | بھلا وصل میں کیا ٹھکانا رہے گا
جو مٹ جائے گا ہو کے خاک اس گلی میں | وُہ اچھا رہا ہے وہ اچّھا رہے گا
اسے کیا ہو پروائے محشر جو تیرا | بدستور محوِ تماشا رہے گا
وُہ حسن و محبّت میں یکساں ہی کامل | وُہ دونوں کی آنکھوں کا تارا رہے گا

ترے عشق میں دعویٰ صبر حسرتؔ
ابھی تک بھلا کیا رہا کیا رہے گا

چھیڑتی ہے جو یادِ یار بہت | دل شبِ غم ہے بیقرار بہت

اب نہ دیکھیں گے تیری راہ کہ ہم　　رہ چکے ہیں خراب و خوار بہت

ہم اسیرانِ ہجر کو نہ رُلا　　دیکھ اے ابرِ نو بہار بہت

لُطف ہے پھر بھی ہم پہ غیر سے کم　　آپ کہتے رہیں ہزار بہت

حالِ دل کم کہا کر و حسرت

اُن کو ہوتا ہے ناگوار بہت

وُہ قامتِ بلند نہیں در قبائے ناز　　اک سروِ ناز ہے جو بنا ہو برائے ناز

اُس نازنیں پہ ختم ہیں سب شیوہ ہائے ناز　　جس کو بنا کے خود بھی ہی نازاں خدائے ناز

کیا کیا نہ آرزو کے بڑھیں دل میں حوصلے　　رکھدیں کبھی جو فرق ہوس پہ وُہ پائے ناز

اربابِ اشتیاق ہیں اور انتہائے شوق　　حالانکہ حُسن یار ہے اور ابتدائے ناز

ہم پر نگاہِ یار سے گزرا جو تھا کبھی　　ہے آجتک وُہ پیش نظر ماجرائے ناز

کچھ یُوں نہیں اپنے حُسن پہ مغرور تھا وہ شوخ　　کچھ لے اُڑی ہے اور بھی اسکو ہوائے ناز

اہلِ نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار — اک بات اُن میں اور بھی کچھ ہے ورائے ناز

پھیلی جو اُن کے برقِ تبسّم کی روشنی — لبریزِ نُور ہو گئی یکسر فضائے ناز

حیران کار حُسنِ بتاں ہے زبانِ عشق — یعنی وُہ مدح غمزہ کرے یا ثنائے ناز

شوقِ لقائے یار میں مرتے تو ہیں مگر
حسرت جو نقدِ جاں بھی نہ ٹھہرے بہائے ناز

چھُپے گی تری دوست داری کہاں تک — کرے گا دل انکارِ یاری کہاں تک

خدا جانے آخر ترے غمزدوں کو — ستائے گی بادِ بہاری کہاں تک

نظر باز اُڑا لیں گے سب حال شب کا — چھپے گی وُہ چشمِ خماری کہاں تک

کرے گی فقیروں سے اے شاہِ خوباں — تغافل تری شہریاری کہاں تک

ہمیں حالِ دل عرض کرنے نہ دے گی — بھلا اُن سے بے اختیاری کہاں تک

غرور آپ کا کم نہ ہو گا نہ ہو گا — جتائیں گے ہم خاکساری کہاں تک

تمنّا کو اس حد پہ رہنے نہ دے گی　　ترے حسن کی بیقراری کہاں تک

کرو سیرِ دنیائے حیرت بھی حسرتؔ
خرد مندی و ہوشیاری کہاں تک

روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں　　اک تماشا دکھا گئیں آنکھیں
مِل کے اُن کی نگاہ جادو سے　　دل کو حیراں بنا گئیں آنکھیں
مجھکو دکھلا کے راہِ کوچۂ یار　　کس غضب میں پھنسا گئیں آنکھیں
اُس نے دیکھا تھا کس نظر سے مجھے　　دل میں گویا سما گئیں آنکھیں
محفلِ یار میں بہ ذوقِ نگاہ　　لطف کیا کیا اُٹھا گئیں آنکھیں

حال سننے وہ کیا مرا حسرتؔ
وہ تو کہئے سُنا گئیں آنکھیں

پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو
مجھکو دیکھو مرے مرنے کی تمنّا دیکھو

جَور پر جَور جفاؤں پہ جفائیں دیکھیں
حوصلا اپنی محبّت میں ہمارا دیکھو

بزمِ اغیار میں بے جا ہیں تمہاری یہ ستم
اب نہ کرنا مری جانب کو اشارا دیکھو

ہم نہ کہتے تھے بناوٹ ہے یہ سارا غصّہ
ہنس کے لو پھر وُہ انہوں نے ہمیں دیکھا دیکھو

مستیٔ حسن سے اپنی بھی نہیں تم کو خبر
کیا سنو عرض مری حال مرا کیا دیکھو

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال
شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو

سر کہیں بال کہیں ہاتھ کہیں پاؤں کہیں
ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو

اب وُہ شوخی سے یہ کہتے ہیں ستمگر ہیں جو ہم
دل کسی اور سے کچھ روز کو بہلا دیکھو

واعظو منہ میں تمہارے بھی بھر آئے پانی
مئے رنگیں کا جو ساغر سے چھلکنا دیکھو

بات کیا ہے جو ہوئے جاتے ہو تم یونہیں خفا
مجھکو دیکھو نہ مرے دل کا دھڑکنا دیکھو

دیکھنا زلف و رخ تمہیں ہر وقت
شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو (میر حسن)

ہوسِ دید مٹی ہے نہ مٹے گی حسرت
دیکھنے کے لئے چاہو اُنہیں جتنا دیکھو

گھٹے گا تیرے کوچہ میں وقار آہستہ آہستہ
بڑھے گا عاشقی کا اعتبار آہستہ آہستہ

بہت نادم ہوئے آخر وہ میری قتلِ ناحق پر
ہوئی قدرِ وفا جب آشکار آہستہ آہستہ

جِلائے شوق سے آئینۂ تصویر خاطر میں
نمایاں ہو چلا روئے نگار آہستہ آہستہ

محبت کی جو پھیلی ہے یہ نکہت باغِ عالم میں
ہوئی ہے منتشر خوشبوئے یار آہستہ آہستہ

ملا کر خاک میں مجھکو جھکی ہی شرم سے لیکن
اُٹھے گی پھر وہ چشم فتنہ کار آہستہ آہستہ

دل و جان و جگر، صبر و خرد جو کچھ ہی پاس اپنے
یہ سب کر دیں گے ہم اُن پر نثار آہستہ آہستہ

اثر کچھ کچھ رہیگا وصل میں بھی رنجِ فرقت کا
دلِ مضطر کو آئے گا قرار آہستہ آہستہ

نہ آئیں گے وہ حسرتؔ انتظارِ شوق ہے یونہیں
گزر جائیں گے ایامِ بہار آہستہ آہستہ

ف اکثر بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے (میر)

مستی کے پھر آ گئے زمانے
آباد ہوئے شراب خانے

ہر پھول چمن میں زر بکف ہے
بانٹے ہیں بہار نے خزانے

سب ہنس پڑے کھلکھلا کے غنچے
چھیڑا جو لطیفہ اک صبا نے

سرسبز ہوا نہالِ غم بھی
پیدا وہ اثر کیا ہوا نے

رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی
واعظ کے نہ چل سکے بہانے

کر دوں گا میں ہر ولی کو میخوار
توفیق جو دی مجھے خدا نے

ہم نے تو نثار کر دیا دل
اب جانے وہ شوخ یا نہ جانے

بیگانۂ مے کیا ہے مجھ کو
ساقی کی نگاہِ آشنا نے

مسکن ہے قفس میں بلبلوں کا
ویران پڑے ہیں آشیانے

اب دل ہے نہ عاشقی کے چرچے
سب خواب وہ ہو گئے فسانے

اب کاہے کو آئیں گے وہ حسرت
آغاز جنوں کے پھر زمانے

تیری جفا بھی ہے وفا، اے بکمال دلبری
تیرے ستم سے دیتے ہیں لوگ مثال دلبری

بات ہے تیری حیلہ جو صرف بہ ناز گفتگو
چال ہے تیری فتنہ خو مست بہ حال دلبری

مہر سپہر حُسن ہو باخط و خالِ گُل رُخی
ماہِ تمام ناز ہو باسن و سال دلبری

اس کے سوا کہ ہے یہ خو، وصفِ بُتانِ ماہرو
کچھ بھی جو جانتا ہو تو کیا ہے مآل دلبری

ذات پہ جن کی ختم تھا شیوہ جور برملا
آج ہیں بر سرِ وفا پھر بہ خیال دلبری

حسرتِ پاکباز کے گریۂ شوق سے رہے
تازہ یونہیں خدا کرے تیرا نہال دلبری

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں　　دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں

عقلِ صبر آشنا سے کچھ نہ ہوا　　شوق کی بیقراریاں نہ گئیں

دن کی صحرا نوردیاں نہ چھٹیں　　شب کی اختر شماریاں نہ گئیں

تھے جو ہم رنگ ناز اُن کے ستم　　دل کی امّید واریاں نہ گئیں

حُسن تک جب رہا نظارہ فروش　　صبر کی شرمساریاں نہ گئیں

طرزِ مومن میں مرحبا حسرت
تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

لایا ہے دل پر کتنی خرابی　　اے یار تیرا حسنِ شرابی

پیراہن اُس کا ہے سادہ رنگیں　　یا عکس مے سے شیشہ گلابی

عشرت کی شب کا وُہ دورِ آخر　　نورِ سحر کی وُہ لاجوابی

پھرتی ہے ابتک دل کی نظر میں　　کیفیّت ان کی وُہ نیم خوابی

بزمِ طرب ہے، وہ بزم کیوں ہو　　ہم غمزدوں کو واں باریابی

اُس نازنیں نے باوصفِ عصمت (ق) کی وصل کی شب وہ بے حجابی

شوق اپنی بھولا گستاخ دستی

دل ساری شوخی حاضر جوابی

❊

بیسویں صدی کے چند اور شعراء

فانی:۔ شوکت علی ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ بریلی اور علی گڈھ میں تعلیم حاصل کی۔ لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے۔ جب اس پیشہ میں کامیابی نہ حاصل ہوئی تو حیدرآباد میں محکمۂ تعلیم میں ملازمت کرلی۔ لیکن وہاں بھی کامیاب نہ رہے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں ناکام و نامراد اس دُنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی شاعری ان ہی حالات کا آئینہ ہے:۔

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کرجا   مردانہ وار جی اور مردانہ وار مرجا
دنیا کے رنج و راحت کچھ ہوں تری بلا سے   دنیا کی ہر ادا سے منہ پھیر کر گذر جا

اس بحرِ بیکراں میں ساحل کی جستجو کیا
کشتی کی آرزو کیا ڈوب اور پار اُتر جا

یہ میکدہ ہے پاسِ آدابِ میکدہ کر
اوّل خراب آ اور آخر خراب تر جا

گھبرا گیا خرد کی تاریکیوں سے فانی
اے نورِ عشق دل کی گہرائیوں میں بھر جا

غم رہ گیا ہے عہدِ محبت کی یادگار
یہ بھی نہ ہو نصیبِ دلِ دشمناں کہیں

منزلِ عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

گل میں وُہ اب نہیں ہے جو عالم تھا خار کا
اللہ کیا ہوا وُہ زمانہ بہار کا

مَر کے ٹُوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات　　مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

بے ذوقِ نظر بزم تماشا نہ رہے گی　　مُنھ پھیر لیا ہم نے تو دُنیا نہ رہے گی

سائل، نواب سراج الدّین خاں، خاندان لوہارو کی یادگار اور داغ دہلوی کے داماد اور شاگرد تھے۔ ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۵ء میں وہیں انتقال کیا۔ ان کے کلام میں قلعہ معلّٰی کی زبان کا چٹخارہ اور داغ کی شوخیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔

ملے غیروں سے، مُجھ سے رنج، غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وفادشمن، جفاجو کا ستم، یوں بھی ہے اور یوں بھی
تم آؤ مرگ شادی ہے، نہ آؤ مرگِ ناکامی
نظر میں اب رہِ ملکِ عدم، یوں بھی ہے اور یوں بھی

مرے سر پر بھی ٹوٹا ہے تمہارے پاؤں بھی چُومے
غرض پیرِ فلک کی پُشت خَم، یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ مسجد ہے یہ میخانہ، تعجُّب اس پہ آتا ہے
جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تجھے نوّاب بھی کہتے ہیں، شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانہ میں ترا سائل بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مضموں جو آیا ذہن میں سانچے میں ڈھل گیا
سائل تمہارے شعر کی تعریف کیا کریں

جنابِ داغ کا تلمیذ و یادگار ہوں میں
ظہیر و ارشد و غالب کا ہوں جگر گوشہ

جلیل : جلیل حسن۔ جلیلُ القدر فصاحت جنگ۔ ۱۸۶۹ء میں مانکپور

(اودھ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد دکن میں انتقال کیا۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے اور میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خاں کے استاد۔ کلام میں استاد کا رنگ نظر آتا ہے۔

مُنھ پھیر کے یوں چلی جوانی   یاد آگیا رُوٹھنا کسی کا

ہوئی مُدّت کہ چمن چھوٹ گیا   اب ہمیں کیا جو بہار آئی ہے

دل گیا دل لگی نہیں جاتی   روتے روتے ہنسی نہیں جاتی

اہلِ غرض کو منھ نہ لگاؤ، بلا کے ہیں   یُوسف کہیں گے تُم کو پیمبر بنائیں گے

اگر میں ہوش میں آتا تو یہ طلسمِ جہاں   مری نگاہ میں بھولا سا خواب ہو جاتا

تبسّم تھا اِس رنگ سے اُن کے لب پر میں سمجھا کوئی جام چھلکا رہا ہے

ستم کرنے والے یہاں اور بھی ہیں نہ آسماں آسماں اور بھی ہیں

عجب حوصلہ ہم نے غنچہ کا دیکھا تبسّم پہ ساری جوانی لٹا دی

زمانہ ہے کہ گذرا جا رہا ہے یہ دریا ہے کہ بہتا جا رہا ہے

یاس ویگانہ : واجد حسین، وطن عظیم آباد۔ ولادت ۱۸۷۵ء وفات ۱۹۵۶ء
شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ تصانیف غالب شکن، چراغِ سخن، آیاتِ وجدانی وغیرہ

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نَفَس عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا
مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے مزاج اُس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

سیماب: عاشق حسین۔ ۱۸۸۰ء میں اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے
داغ کے شاگرد تھے۔ ۱۹۵۱ء میں کراچی میں انتقال کیا۔

یہ دُنیا اگر میرے قابل نہیں ہے ترے پاس یارب جہاں اور بھی ہیں
بڑھاؤ نہ منزل کی شمعیں ابھی سے ابھی راہ میں کارواں اور بھی ہیں

جب مُلتفت ہوئی ہے اُن کی سکوں نگاہی
چُن چُن کے لے گئی ہے کانٹے دل و جگر کے

کون جانے آسماں سے اُن کو کیا اُمید ہے
مرتے مرتے بھی جو سُوئے آسماں دیکھا کئے

کہانی میری رُودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سُنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

ہائے سیماب اُس کی مجبوری — جس نے کی ہو شباب میں توبہ

ناطق: سعید احمد۔ ۱۸۷۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۹۵۳ء میں پاکستان آکر وفات پائی۔

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عُمر گُذاری ہے اِس طرح

چھپ کر ہوا کے جھونکوں میں آتی ہیں بجلیاں
ناطق چمن یہ رہنے کے قابل نہیں رہا

دو بارہ اس میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا
تمہاری پہلی نظر کا جواب ہو نہ سکا

ہے وہی دیوانِ مطبوعہ مرا ـــــــ جس قدر لوگوں کو ناطق یاد ہے

وحشت: رضا علی۔ ۱۸۸۱ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ڈھاکہ میں ۱۹۵۵ء میں انتقال کیا۔

اک یادِ عیش جس پہ ہو قرباں ہزار عیش
لیکر چلے ہیں ساتھ تری انجمن سے ہم

کیا رنگ انتقامِ خزاں کا ہو دیکھئے
ڈرنے لگے ہیں جوشِ بہارِ چمن سے ہم

رہی یکچند نقشِ آرزو کی دل میں رنگینی
وہ اک بیکار سی تحریر تھی میں نے مٹا ڈالی

فریب کھاتا ہے ہر اک قدم پہ منزل کا
وہ کیا کرے کہ نہ دیکھا ہو جس نے منزل کو

تمت

کتبہٗ: ابوضیاء الدین صدیقی
۱۹۵۸ء

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ ایک خوش ذوق اور عالی پایہ سخن فہم نے شعرائے اُردو کا تذکرہ اس قدر سلیقے سے مُرتب کیا ہے کہ امیر خسرو اور ولی دکنی سے لے کر ہمارے زمانہ کے متغزلین تک اس میں آگئے ہیں۔

کتاب کے مقدمے ہیں، ہر دَور کی تمہیدیں ہیں، شعرا کے ذکر ہیں، اِن کے کلام کے انتخاب ہیں۔ غرض ہر چیز ہیں فاضل مُرتب نے طُول و اطناب سے پرہیز کیا ہے۔ صرف کام کی باتیں لکھی ہیں اور صرف کام کے اشعار منتخب کئے ہیں۔ چونکہ فاضل مُرتب مشرقی و مغربی عُلُوم کے جامع ہیں اس لئے اِنتخاب اشعار میں ظاہری محاسن کے علاوہ جذباتِ صحیحہ کو بھی مدِ نظر رکھا ہے، اور اس چیز نے کتاب کی قدر و وقعت بہت بڑھا دی ہے۔

ایک قابلِ تعریف بات اس کتاب میں یہ ہے کہ اس میں باطنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری محاسن کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ کتابت خوبصورت، طباعت خوبصورت، کاغذ خوبصورت، کوئی شخص اس کتاب کو پڑھنے میں اُکتاہٹ کا شکار نہیں ہو سکتا۔ کتاب ساڑھے پانسو صفحے پر ختم ہوئی ہے۔ اور جس طرح مُرتب نے اس کی ترتیب میں محنت اور خوش مذاقی سے کام لیا ہے اسی طرح ناشر نے بھی اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی۔

میں "سفینۂ غزل" کی اشاعت پر مُرتب و ناشر کو مستحقِ مُبارکباد سمجھتا ہوں اور اگر ناشر بھی خود سید عباس ہی ہیں تو سُبحان اللہ۔ ع

حُسنت زاتفاقِ ملاحت جہاں گرفت

(مولانا) عبدالمجید سالک

۱۶ جولائی۔ مسلم ٹاؤن۔ لاہور

میں نے سید محمد عباس صاحب کی ترتیب دی ہوئی کتاب سفینۂ غزل کو جستہ جستہ دیکھا۔ افسوس کہ اسے بالاستیعاب پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس گراں بہا ادبی خدمت کیلئے وہ دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ کتاب کے مختلف پہلو تفصیل و تشریح کے محتاج ہیں۔ اجمالاً عرض کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ میرے محدود علم کے مطابق یہ اپنی نوعیت کا پہلا انتخاب ہے جس میں نہ اردو شاعری کا کوئی دو[illegible] ہوا ہے اور نہ اساتذۂ فن میں سے کسی قابلِ ذکر شخصیت کو چھوڑا گیا ہے۔ گویا یہ مجموعہ لذت شناسانِ شعر و ادب کو ا[illegible]وین سے بڑی حد تک بے نیاز کر سکتا ہے۔

۲۔ انتخاب فی الجملہ اچھا ہے اور میرے نزدیک انتخاب سے بڑھ کر قابلِ ستائش کتاب کی ترتیب ہے۔ تنہا اسی کے چند صفحے سامنے رکھ لینے سے پوری اردو شاعری کی سرگزشت اجمالاً سامنے آجاتی ہے۔

۳۔ حُسنِ کتابت اور حُسنِ طباعت کی جتنی بھی تعریف کروں وہ کم ہوگی اس لئے کہ یہ پہلو بتانے سے نہیں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

(مولانا) غلام رسُول مہر

مسلم ٹاؤن۔ لاہور۔ ۱۲ جون ۱۹۵[illegible]

میاں بشیر احمد نے مجھ سے ایک بار نہیں کئی بار فرمائش کی کہ اُردو شعراء کے کلام کا ایک ایسا انتخاب مُرتّب کر دو جیسا انگریزی میں پال گریو وغیرہ کا ہے۔ مجھے تو یہ توفیق نہ ہوئی لیکن سیّد محمد عبّاس صاحب نے ایک گونہ یعنی غزل کی حد تک اس کی تعمیل کر دی۔

مقدمے کے بعد آغاز امیر خُسرو رحمۃ اللہ علیہ سے کی ہے اور دو ایک چیزیں جو ان سے منسوب ہیں بطور انتخاب لکھ دی ہیں۔ اصل ابتدا ولی سے ہوتی ہے اور بیسویں صدی کے نامور اور مشہور شعراء پر یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

انتخاب سے فاضل مُرتّب کا حُسنِ ذوق ظاہر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہمارے شعراء کے کلام کو بڑے شوق سے پڑھا ہے اور اس میں سے ایسے پھول چُن لئے ہیں جو ہمیشہ شگفتہ رہیں گے۔ یہ کتاب اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کی وجہ سے ایسی ہے کہ حضر و سفر میں ساتھ رہے اور جب کبھی گردِشِ دنیا سے جی بیزار ہو یا کام کرتے کرتے طبیعت تھک جائے تو اس سفینے کے دو چار صفحے طبع میں تازگی پیدا کر دیں گے اور ہمیں ایک دوسرے عالم میں لے جائیں گے۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ آدمی طرح طرح کی کلفتوں اور آلودگیوں سے گھرا ہوا ہے ایک ایسی کتاب کی معیّت جو رفیق بھی ہو اور دل سوز بھی کچھ کم نعمت نہیں اور جو کوئی اس کے مطالعہ سے محظوظ ہو گا وہ سیّد محمد عبّاس کے حق میں دعا کرے گا:

(ڈاکٹر مولوی) عبدالحق

۲۴ جون ۱۹۵۸ء

غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ ایک خوش ذوق اور عالی پایہ سخن فہم نے شعرائے اردو کا تذکرہ اس قدر سلیقے سے مُرتب کیا ہے کہ امیر خسرو اور ولی دکنی سے لے کر ہمارے زمانہ کے متغزلین تک اس میں آگئے ہیں۔

کتاب کے مقدمے میں، بر وعد کی تمہید میں، شعرا کے ذکر میں، اِن کے کلام کے انتخاب میں، غرض ہر چیز میں فاضل مُرتب نے طُول و اطناب سے پرہیز کیا ہے۔ صرف کام کی باتیں لکھی ہیں اور صرف کام کے اشعار منتخب کئے ہیں چونکہ فاضل مُرتب مشرقی و مغربی عُلوم کے جامع ہیں اس لئے انتخاب اشعار میں ظاہری محاسن کے علاوہ جذبات صحیحہ کو بھی مدِ نظر رکھا ہے، اور اس چیز نے کتاب کی قدر و قیمت بہت بڑھا دی ہے۔

ایک قابلِ تعریف بات اس کتاب میں یہ ہے کہ اس میں باطنی خُوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری محاسن کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ کتابت خُوبصورت، طباعت خُوبصورت، کاغذ خُوبصورت۔ کوئی شخص اس کتاب کو پڑھنے میں اُکتاہٹ کا شکار نہیں ہو سکتا۔ کتاب ساڑھے پانسو صفحے پر ختم ہوتی ہے، اور جس طرح مُرتب نے اس کی ترتیب میں محنت اور خوش مذاقی سے کام لیا ہے اسی طرح ناشر نے بھی اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی۔

میں سفینۂ غزل کی اشاعت پر مُرتب و ناشر کو مستحقِ مُبارکباد سمجھتا ہوں اور اگر ناشر بھی خود سید عباس ہی ہیں تو سُبحان اللہ۔ ع

مصنفِ زاتفاق ملاحت جہاں گرفت

(مولانا) عبدالمجید سالک

۱۲ جولائی۔ مسلم ٹاؤن۔ لاہور

میں نے سید محمد عباس صاحب کی ترتیب دی ہوئی کتاب سفینۂ غزل کو جستہ جستہ دیکھا۔ افسوس کہ اسے بالاستیعاب پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس گراں بہا ادبی خدمت کیلئے وہ دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ کتاب کے مختلف پہلو تفصیل و تشریح کے محتاج ہیں، اجمالاً عرض کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ میرے محدود علم کے مطابق یہ اپنی نوعیت کا پہلا انتخاب ہے جس میں اردو شاعری کا کوئی دور نظر انداز نہ ہوا ہے نہ اساتذۂ فن میں سے کسی قابلِ ذکر شخصیت کو چھوڑا گیا ہے۔ گویا یہ مجموعہ قدر شناسانِ شعر و ادب کو اکثر دواوین سے بڑی حد تک بے نیاز کر سکتا ہے۔

۲۔ انتخاب فی الجملہ اچھا ہے اور میرے نزدیک انتخاب سے بڑھ کر قابلِ ستائش کتاب کی ترتیب ہے۔ تنہا اسی کے چند صفحے سامنے رکھ لیجئے تو پوری اردو شاعری کی سرگزشت اجمالاً سامنے آجاتی ہے۔

۳۔ حُسنِ کتابت اور حُسنِ طباعت کی جتنی بھی تعریف کروں وہ کم ہوگی اس لئے کہ یہ پہلو تبائے سے نہیں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

(مولانا) غلام رسول مہر

مسلم ٹاؤن۔ لاہور ۱۲ جون ۱۹۵۵ء